ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

فلسطین کی کلیاں

غسان کنفانی کے منتخب افسانے

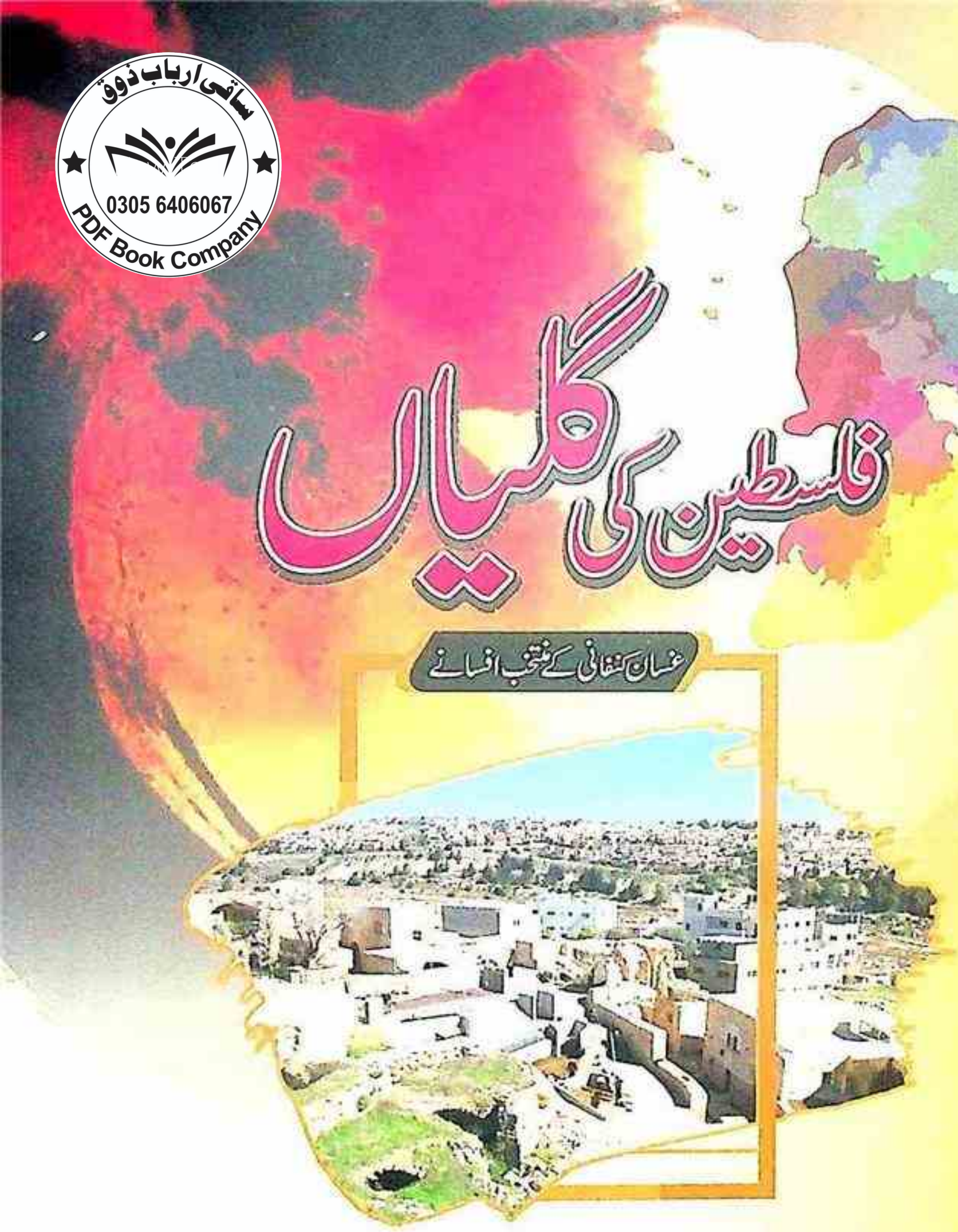

عربی سے اردو ترجمہ

ڈاکٹر محمد علی اختر ندوی

غسان کنفانی کے منتخب افسانے

فلسطین کی گلیاں

عربی سے اردو ترجمہ

ڈاکٹر محمد علی اختر ندوی

تقدیم و نظر ثانی

ڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی

0305 6406067
PDF Book Company

مولانا ممتاز علی ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ فاؤنڈیشن

©جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ

FALASTEEN KI GALYAN

Selected Short Stories of Ghassan Kanafani

ISBN: 978-81-945375-0-2
Year of Edition: 2020

By : Dr. Mohammad Ali Akhtar
At & P.O. Ekhatha, District Madhubani, Bihar, 847227
Email : mdaliakhtar@gmail.com, Mob: 9910380158

نام کتاب : فلسطین کی گلیاں
(غسان کنفانی کے منتخب افسانے)
مترجم : ڈاکٹر محمد علی اختر ندوی
تقدیم ونظر ثانی : ڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی
طبع اول : فروری ۲۰۲۰
قیمت : ۱۵۰ روپئے
صفحات : ۱۴۴
ناشر : مولانا ممتاز علی ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ فاؤنڈیشن
مطبع : مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

0305 6406067
PDF Book Company

ملنے کے پتے

C-222/2, First Floor, Shaheen Bagh, New Delhi-25

Maulana Mumtaz Ali EducationalResearch Foundation
Ekhatha, Madhubani, Bihar-847227

انتساب

ان کتابوں اور کتابوں کے مصنفین کے نام

جن کی وجہ سے

میرے اندر پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔

میرے کمرے کو سجانے کی تمنا ہے تجھے
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں

(جون ایلیا)

فہرست مضامین

	عناوین	صفحہ
	انتساب	۳
	فہرست	۵
	پیش گفتار	۷
	تقدیم	۱۱
	افسانے	
۱	کیک فروش	۲۹
۲	چوری کی شرٹ	۵۱
۳	بیڈ نمبر ۱۲ کی موت	۶۳
۴	اداس سنتروں کی سرزمین	۹۳
۵	ممنوعہ ہتھیار	۱۰۵
۶	کچھ نہیں!	۱۲۱
۷	چھ چیل ایک بچہ	۱۳۱

ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

ساقی ارباب ذوق
03035406067
PDF Book Company

پیش گفتار

بچپن سے ہی مجھے کہانیوں کا شوق رہا ہے۔ بچوں کے ماہنامہ رسالوں کی کہانیاں اب بھی موقع ملے تو شوق سے پڑھتا ہوں۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ دس گیارہ سال کی عمر میں ہی مجھے اردو کے مشہور تاریخی ناول نگار جیسے نسیم حجازی، عنایت اللہ التمش، صادق سردھنوی کے تاریخی ناول پڑھنے کا موقع مل گیا اور پھر افسانوں اور ناولوں میں میری دلچسپی بڑھتی گئی۔ ۱۲ سال کی عمر تک جب میں نے حفظ مکمل کیا، میں محمد بن قاسم، اور تلوار ٹوٹ گئی، یوسف بن تاشفین، آخری چٹان، داستان مجاہد، عرب کا چاند، افریقہ کی دلہن، داستان ایمان فروشوں کی، وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب ناول میں نے چھپ کر ہی پڑھے ورنہ اس عمر میں اور وہ بھی حفظ کرتے ہوئے اس کی اجازت کون دیتا! اس سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ ایک گاؤں میں یہ ناول مجھے کہاں سے ملے؟ ادب کا شوق رکھنے والے اور ایسے ناولوں کا ذخیرہ گھر میں رکھنے والے نگینے لوگ ہر جگہ نہیں، تو کہیں کہیں تو مل ہی جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نگینہ میرے گاؤں یکہتہ کے قریب عید گاہ محلہ کے جناب مظفر عالم صاحب ابن جناب مرحوم محب اللہ صاحب ہیں، جو ابھی مہاراشٹر کے جالنہ میں امامت اور تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پتہ نہیں ان کو یہ شوق کیسے چڑھا، لیکن ان کا گھر ایسے ناولوں سے بھرا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی ابرار احمد میرے حفظ کے ساتھی تھے۔ وہی میرے اور ناولوں کے

درمیان میرا واسطہ بنے۔ مجھے نہیں پتہ ابرار کو ناولوں کا کتنا شوق تھا، لیکن وہ میرے آتش شوق کو بھڑکانے کا سامان ضرور مہیا کرتے تھے۔

ندوۃ العلماء میں میرا تعارف منفلوطی سے ہوا اور عالیہ ثالثہ ہی میں، میں ان کے سارے ناول جو ندوۃ العلماء میں مہیا تھے چٹ کر چکا تھا۔ منفلوطی کے نظرات اور عبرات کا اثر مجھ پر گہرا تھا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی نے میرا رجحان طبع زاد ادبی افسانوں اور ناولوں کی طرف موڑ دیا اور میرا شوق جلد ہی عربی فکشن سے عشق میں بدل گیا۔

یہاں میں اعتراف کرتا چلوں کہ کہانیوں، داستانوں اور فکشن میں بے انتہا دلچسپی اور بے شمار ادبی شاہکار پڑھنے کے باوجود میرے اندر کبھی خود کہانی لکھنے کا شوق پیدا نہیں ہوا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرے اندر تخلیقی صلاحیت کی کمی ہے۔ لیکن مجھے ترجمہ کرنے کا شوق ہے۔ ترجمے کا عمل عمومی لحاظ سے ایک غیر دلچسپ عمل ہے، لیکن مجھے ترجمہ کرنے میں مزہ آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کے شروع ایام سے ہی میں نے ترجمہ شروع کر دیا تھا۔ عربی افسانوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کے ساتھ میں نے اردو سے عربی میں بھی افسانوں کا ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکے ہیں۔ عربی سے اردو میں ترجمہ شدہ افسانوں کا یہ میرا پہلا مجموعہ ہے جسے شائع کرنے کی میں نے ہمت کی ہے۔

ترجمہ تخلیق کے برابر تو نہیں، لیکن تخلیق سے کم مشکل بھی نہیں ہے۔ ترجمے کے فن، اور اس فن کے اصول وضوابط پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ترجمے کی مشکلات کا اصل اندازہ ترجمہ کرتے ہوئے ہی ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کی یہ رائے بھی ہے کہ ادبی

شہ پاروں کا ترجمہ ناممکن ہے، جو بڑی حد تک حقیقت کے قریب ہے کیونکہ ادب، الفاظ و معانی کے بکھرے پھولوں کو جمع کر کے حسین گلدستہ تیار کرنے کا نام ہے اور ترجمے میں معانی و افکار کو تو منتقل کیا جاسکتا ہے لیکن الفاظ کے دروبست، ترکیب کی نفاست، استعاروں کی چاشنی کو منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ معانی و افکار کے حوالے سے بھی تہذیبی علامتوں کو ایک زبان سے دوسرے زبان میں منتقل کرنا دشوار گذار کام ہے۔ تمام مشکلات کے باوجود ترجمہ ایک ناگزیر عمل ہے اور تہذیبوں اور زبان و ادب کی ترقی کا سبب بھی ہے۔ اور اسی لئے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمے کی روایت صدیوں سے جاری وساری ہے۔

لفظی ترجمہ معیوب سمجھا جاتا ہے ہے، لیکن میری کوشش رہتی ہے کہ مفہوم کے ساتھ میں مؤلف کے الفاظ کی بھی بھرپور رعایت رکھوں، اس طرح کہ معانی میں بھی خلل نہ آئے اور ہر لفظ کا ترجمہ بھی ہو جائے۔ میں ادیب نہیں لیکن مجھے ادب سے عشق ہے جس کے اظہار کا یہ ترجمہ ایک ذریعہ ہے۔ شاید کہ ترجمے کی یہ چھوٹی سی کوشش آپ کو پسند آئے۔

یہاں میں صمیم قلب سے شکر گذار ہوں اپنے دوست ڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی کا جنہوں نے اس مجموعے میں شامل افسانوں کے خالق بے باک و بے نظیر ادیب غسان کنفانی کی حیات اور ادبی کارناموں پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے عربی میں ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کی ہے اور جو تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ایک افسانہ نگار بھی ہیں، اور اردو، عربی، ہندی اور انگریزی چار زبانوں میں افسانے لکھ رہے ہیں، کہ انہوں نے نہ

صرف ان افسانوں پر نظر ثانی کے لئے حامی بھری بلکہ غسان کنفانی کی حیات و ادبی خدمات اور ان افسانوں کے ادبی قدر و قیمت پر ایک مبسوط و وقیع مقدمہ تحریر کیا، جس سے اس مجموعے کی وقعت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ میرے شکریے کے مستحق میرے کولیگ صفی احمد ندوی ململی بھی ہیں جنہوں نے ترجمے کو حرفا حرفا پڑھا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ ناسپاسی ہو گی اگر میں یہاں تذکرہ نہ کروں اپنے عزیز دوست اور کئی کتابوں کے مولف ڈاکٹر عطاء اللہ سنابلی کا جنہوں نے اس مجموعے کی ترتیب و تزئین اور اسے مطبع تک پہونچانے میں میری بھرپور مدد کی۔ شکریہ ان تمام دوستوں اور عزیزوں کا بھی جن کی حوصلہ افزائیاں ہمیشہ میرے لئے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔

ترجمے کی میری کوششیں ان شاء اللہ جاری رہیں گی اور اسی لئے میں قارئین سے درخواست کروں گا وہ ترجمے کے حوالے سے اپنے قیمتی مشوروں سے ضرور نوازیں اور ترجمے میں اصلاح کی ضرورت ہو تو ضرور آگاہ کریں تاکہ میری حوصلہ افزائی بھی ہو اور میری اصلاح بھی۔

وماتوفیقی الا باللہ۔

محمد علی اختر

۲۲۲/۲، فرسٹ فلور، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ موبائل: ۹۹۱۰۳۸۰۱۵۸

تقدیم

ازڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی
مدیر سہ ماہی عربی مجلّہ "اقلام الہند"

غسان کنفانی ایک ایسے عالمی شہرت یافتہ فلسطینی ادیب ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں، ناولوں، اور صحافتی مضامین کے ذریعے فلسطینی مسئلے کو دنیا کے سامنے ایک انسانی المیہ کی شکل میں پیش کیا- غسان نے اپنے ذہن و دماغ، افکار و خیالات، اور قلم و قرطاس کو فلسطین کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اور اپنی تمام توانائیاں اسی کاز کے لئے صرف کر رکھی تھیں- غسان کا ادب مزاحمتی ادب ہے بلکہ در حقیقت ان کی پوری زندگی ہی مزاحمت سے عبارت ہے- وہ اس وقت پیدا ہوئے جب فلسطین میں ۱۹۳۶ کا انقلاب اپنے عین شباب پر تھا، اور انھیں اس وقت فلسطین کو چھوڑنا پڑا اور بے گھر بار ہو کر جلاوطنی و پناہ گزینی کی مشقتیں برداشت کرنی پڑیں جب ان کی عمر صرف دس برس کی تھی۔ فلسطین کے اس قلمی جانباز کی جرأتوں کی تاب نہ لاکر اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد نے ۱۹۷۲ میں انھیں اس وقت شہید کر دیا جب ان کی عمر صرف ۳۶ برس کی تھی-

غسان کنفانی اپنے اختراعی مزاج اور جدت طبع ذہانت کی وجہ سے کئی چیزوں میں دوسروں سے سبقت لے گئے۔ وہ پہلے ایسے شخص ہیں جنہوں نے مقبوضہ فلسطین میں،

جس کا تعلّق اسرائیلی قبضے کے بعد عالم عربی سے پوری طرح منقطع ہو گیا تھا، پائی جانے والی عربی تخلیقات سے لوگوں کو متعارف کرایا اور دو کتابوں کی شکل میں اس کا مطالعہ پیش کر کے یہ بتایا کہ ظلم و ستم کے سایے میں پلنے والا یہ ادب کامیابی اور نجات کی امید سے خالی نہیں ہے۔ ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ غسان نے اپنی ان دونوں کتابوں میں فلسطینی ادب کو ادب مقاومہ یعنی مزاحمتی ادب (Resistance Literature) سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح استعماری اور غاصب طاقتوں کے خلاف لڑنے والے ادیبوں کی کاوشوں کو ایک نئی اصطلاح سے نوازا جو عربی ادب سے آگے بڑھ کر عالمی ادب میں داخل ہوئی اور جلد ہی بہت مقبول ہوئی۔ غسان کنفانی مقبوضہ فلسطین کے عربی ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ اس کے معادی صہیونی ادب کے مطالعے میں بھی مصروف تھے اور یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ صہیونیوں کے وجود اور شعور کی تشکیل میں ان کے ادب نے کیا کردار ادا کیا ہے، اور اس طرح انہوں نے خطیر ترین صہیونی ادب کے اوپر عربی میں پہلا مطالعہ پیش کیا۔ غسان کی یہ غیر معمولی کاوشیں دو اہم حکمتوں یعنی پہلا "اپنے آپ کو جان لو" اور دوسرا "اپنے دشمن کو جان لو" کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں۔

وہبی صلاحیتوں سے مالامال کثیر جہتی شخصیت کا مالک یہ یگانہ روزگار ادیب اپنی مختصر سی عمر کے باوجود اپنے پیچھے ایک عظیم ادبی وراثت چھوڑ گیا جو متنوع صحافتی مضامین، مختلف مطالعوں، متعدد ڈراموں وناولوں، اور افسانوں کے کئی مجموعوں پر مشتمل ہے۔ صحافت کے میدان میں غسان نے وہ مقام حاصل کیا جو بہت کم عربی صحافیوں کو نصیب

ہوا۔ وہ کمال کے مضمون نویس اور ماہر تجزیہ نگار تھے اور خبروں کو پرکھنے میں انھیں خاص امتیاز حاصل تھا اور ان سب میں ان کا اپنا ایک الگ رنگ اور مزاج تھا۔ انہوں نے الفجر، الرأي، الحرية، المحرر، الأنوار، اور الهدف جیسی عربی میگزینوں میں ادارت کے فرائض انجام دئے، اور فلسطینی کاز کے بارے میں پوری قوت اور جذبے کے ساتھ مسلسل لکھتے رہے۔ پہلے قید وبند کی صعوبتیں اور پھر صہیونیوں کے ہاتھوں ان کی شہادت کا سب سے بڑا سبب ان کے شعلہ انگیز صحافتی مضامین ہی تھے۔ وہ صحافت کو معرکہ کارزار سمجھتے تھے اور اسے فلسطینیوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ مانتے تھے۔

جہاں تک غسان کے ڈراموں کا تعلّق ہے تو وہ اپنی زندگی میں ڈرامہ نگار کی حیثیت سے نہیں جانے گئے، کیونکہ اس جانب انہوں نے زیادہ توجّہ نہیں دی۔ البتہ ان کے انتقال کے بعد جب ان کے ڈرامے منظر عام پر آئے تو لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ غسان نے اپنی پوری زندگی میں صرف تین ڈرامے لکھے "الباب" ١٩٦٤، "القبعة والنبي" ١٩٦٧، اور "جسر إلى الأبد" ١٩٦٥، اور ان میں سے صرف ایک اپنی زندگی میں شائع کیا باقی دو ان کی شہادت کے بعد شائع ہوئے۔ پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ ڈرامے غسان کی عام طرز نگارش سے الگ ہٹ کے ہیں اور ان کا فلسطینی مسئلے سے کچھ لینا دینا نہیں، لیکن ان کے مضامین میں تھوڑا سا غور وخوض کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ در حقیقت فلسطین میں واقع ہونے والے المیہ کا آئینہ ہیں، اور رمزیہ طریقے سے اس میں مستقل مزاحمت کے تعلق سے انتہائی اہمیت کے حامل اعلی

پیغامات اور افکار کو لوگوں تک پہونچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ دوسری نگارشات کے بمقابلہ ڈراموں میں انقلاب اور مزاحمت کے مظاہر پیش کرنے میں غسان نے بڑی وسعت اور لامحدودیت سے کام لیا ہے۔ اگر ہم ان کی کہانیوں اور ناولوں میں فلسطین کے موضوع کو کرداروں کی روزمرہ کی زندگی میں موجود پاتے ہیں تو ڈراموں میں ایک عام انقلابی روح نظر آتی ہے جو روزمرہ کی فلسطینی انقلابی شخصیت سے بہت مختلف ہے۔

ناول نگاری غسان کا اہم میدان ہے اور ان کا شمار عربی ناول کے اساطین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی بیانیہ تکنیکی دریافتوں اور فنکارانہ تجربوں کی مدد سے جو بے مثال ناول لکھے وہ عربی ناول نگاری کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غسان نے متعدد ناول لکھے جن میں کچھ پایہ تکمیل کو پہنچے اور کچھ ان کی ناگہانی شہادت کی وجہ سے نامکمل رہ گئے۔ جو ناولیں مکمل ہوئیں انکی تعداد چار ہے: "رجال في الشمس" ١٩٦٣، "ماتبقی لکم" ١٩٦٦، "أم سعد" اور "عائد إلی حیفا" ١٩٦٩۔ جہاں تک نامکمل ناولوں کا تعلق ہے تو وہ تین ہیں: "العاشق"، "الأعمی و الأطرش"، اور "برقوق نیسان"۔ غسان نے اپنا پہلا اور سب سے مشہور ناول "رجال في الشمس" ١٩٦٣ میں اس وقت لکھا جب سرکاری کاغذات نہ ہونے کی وجہ سے لبنان میں انھیں روپوش ہو کر زندگی گزارنی پڑی، اس ناول کو عالمی سطح پر ادبی حلقوں میں خوب خوب سراہا گیا۔

مسئلہ فلسطین اور فلسطینیوں کو پیش آنے والے آلام ومصائب ہی غسان کے تمام ناولوں کا محور ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے فلسطینیوں کی غمناک حالتوں کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم "رجال في الشمس" میں مختلف عمر کے فلسطینی مردوں کو دیکھتے ہیں جو فلسطین کی المناک تباہی کے بعد جس میں ان کی زمینوں اور مکانوں کو لوٹ لیا گیا تھا روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور ایک واٹر ٹینکر میں بیٹھ کر غیر قانونی طریقے سے کویت کی سرحد پار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں- اسی طرح ہم "ماتبقی لکم" میں دیکھتے ہیں کہ فلسطینیوں نے اپنی تمام خوشیوں کو فلسطینی مسئلے کے حل ہونے تک کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ اس ناول کا ایک اہم کردار مریم تیس برس کی عمر پار کر چکی ہے مگر بن بیاہی ہے۔ معروف قلم کار یوسف سامی یوسف کہتے ہیں کہ غسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پہلے ایسے عربی مصنف ہیں جنہوں نے فلسطین کی تباہی کو ایسے شاہکار ناولوں کے ذریعے پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جن میں فن کے اعتبار سے کوئی نقص نہیں ہے، اور بقول روجر اِلین، فلسطینی المیہ کو کوئی دوسرا ناول نگار غسان سے زیادہ مؤثر طریقے سے پیش نہیں کر سکا، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مسئلہ فلسطین سے غسان کو جنون کی حد تک لگاؤ تھا، اور فلسطینیوں کی المناک حالتوں کی تصویر کشی ان کا مشن تھا، اور دوسرے ممالک کے عربوں کا فلسطینیوں کے ساتھ جو پیچیدہ معاملہ تھا اس سے بھی وہ پوری طرح واقف تھے۔

اب ہم رخ کرتے ہیں غسان کنفانی کے افسانوں کی طرف جن سے اس کتاب کا سیدھا تعلّق ہیں کیونکہ اس میں ان کے چیدہ افسانوں کا انتہائی سلیس اور شستہ زبان میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ غسان کا شمار عربی زبان کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور ناول اور ڈراموں کے بمقابلہ اس میدان میں ان کی کاوشیں سب سے زیادہ ہیں۔ عربی افسانہ نگاروں کے درمیان ایک خاص اور ممتاز مقام بنانے میں انھیں اپنے موقف کے التزام، منفرد سیاسی شعور، فنی باریکیوں کی سمجھ، زبان و بیان پر قدرت، فنی تخلیقات سے دلچسپی اور نئے نئے تجربات کرنے کی خواہش سے بڑی مدد ملی۔ فلسطین کے تعلّق سے برپا ہونے والے حادثات اور تغیرات کا غسان کے ادب پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ اس لئے ناقدین ان کے افسانوں کو تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے مرحلے میں جو ۱۹۵٦ سے ۱۹۵۹ تک ہے فلسطینی کردار پوری قوّت ارادی کے ساتھ، مختلف طریقوں سے اپنے جان و مال کی پرواہ کے بغیر اپنے وطن کی دفاع کرتے نظر آتے ہیں، اور ایسا احساس ہوتا ہے جسے گویا یہی ان کا مشن ہے۔ کبھی غسان کے کردار ایسے جنگجو کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جو بے ساختگی سے قدم اٹھا لیتے ہیں، اور کبھی ایسے جان باز جو پوری پلاننگ اور منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ ایک چیز جو اس مرحلے کے تمام افسانوں میں مشترک نظر آتی ہے وہ ہے ان کے موضوعات کا خالص فلسطینی ہونا، اور ان کے کرداروں کا اپنے کام کو انفرادی طور پر انجام دینا۔ ایک خاص بات یہ ہے کی اس مرحلے کے قصّوں میں متوسط طبقے کی کوئی نمائندگی نظر نہیں

آتی، اس کا مطلب قطعاً یہ نہیں کی غسان اس طبقے کے تئیں متعصب تھے، بلکہ یہ اس دور کی حقیقت کی عکاسی تھی۔

دوسرا مرحلہ جو ۱۹۵۹ سے لے کر ۱۹۶۳ کے عرصے پر محیط ہے فلسطینی موضوعات سے تقریباً خالی ہے، کہانیوں میں جنگ و جدال اور فدائی حملوں کی تصویر پیش کرنے کے بجائے سیاسی فکر اور نظریاتی سوچ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس مرحلے کی کہانیوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں الفت و محبّت کے مضامین بھی شامل ہیں جو پہلے اور بعد کے مرحلوں میں ناپید ہیں۔ تیسرا مرحلہ ۱۹۶۵ سے ۱۹۶۹ تک یا یوں کہیں کہ غسان کی شہادت تک ہے۔ اس مرحلے کے کہانیاں اس وقت ہونے والی فوجی و سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے امید سے پر ہیں اور فلسطینیوں میں ایک نئی روح اور نئے جوش و جذبے کے مناظر پیش کرتی ہیں۔ ان کہانیوں میں غسان نے ان تمام مراحل کا احاطہ کیا ہے جن سے جنگجوؤں کو گزرنا پڑ رہا تھا، جیسے وہ تیاری کیسے کرتے تھے، اسلحے کے حصول کے لئے کیا طریقے اپناتے تھے، اپنے نصب العین کی طرف وہ کیسے بڑھتے تھے، اور کس طرح کے خطرات کا انھیں سامنا کرنا پڑتا تھا وغیرہ۔ یہاں پر ان تینوں مرحلوں کے تذکرے سے مقصد یہ تھا کہ غسان کی کہانیوں کی خصوصیات مجموعی طور پر ہمارے سامنے آجائیں کیونکہ زیر نظر مجموعے میں جو منتخب کہانیاں شامل ہیں وہ غسان کے تینوں مرحلوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ غسان کی کہانیاں عام طور سے کیمپوں میں رہ رہے فلسطینی پناہ گزینوں کی زندگی کی زندہ تصویریں ہیں، کیونکہ وہ خود ایک پناہ گزیں تھے اور کیمپ میں زندگی گزارنے کے تلخ

تجربے سے گزر چکے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی بعض کہانیاں مقبوضہ فلسطین کے اندر کی بھی حالت بیان کرتی ہیں۔

اس مجموعے میں مندرجہ ذیل کہانیاں شامل ہیں جن پر ہم مختصراً روشنی ڈالیں گے تاکہ قارئین کو ان کا بیک گراؤنڈ اور موضوع سمجھنے میں آسانی ہو۔

افسانے:

۱. کیک فروش {کعک علی الرصیف}
۲. چوری کی شرٹ {القمیص المسروق}
۳. اداس سنتروں کی سرزمین {أرض البرتقال الحزین}
۴. ممنوعہ ہتھیار {السلاح المحرم}
۵. کچھ نہیں! {لاشئ}
۶. چھ چیل ایک بچہ {ستۃ نسور و طفل}
۷. بیڈ نمبر ۱۲ کی موت {موت سریر رقم ۱۲}

۱. کیک فروش

یہ کہانی غسان نے ۱۹۵۹ میں لکھی تھی اور اس میں ان فلسطینی پناہ گزیں بچوں کی جدوجہد کا تذکرہ کیا ہے جنہیں دو روٹی کمانے کے لئے ذلّت ورسوائی کا گھونٹ پینا پڑتا تھا اور اپنے کنبے کے لئے روزی کمانے کے لئے سخت محنت اور مشقت کرنی پڑتی تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ انھیں لازمی طور پر اپنے اسکول کے اوقات کی بھی پابندی کرنی پڑتی تھی۔ اس میں ۱۱ سال کے ایک لڑکے حامد کی کہانی ہے جو دمشق کے ایک محلے میں جوتا پالش کر کے اپنی روزی کماتا تھا، پھر اس نے ایک سینما ہال کے باہر کیک بیچنا شروع کر دیا جس کے لئے وہ آدھی رات تک شو کے ختم ہونے کا انتظار کرتا تھا، اور کبھی کبھی جب اس سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی تو مجبور ہو کر وہ کیک خود ہی کھا جایا کرتا، اس طرح اسے کیک فروشی چھوڑ کر پھر سے جوتا پالش کرنے کا کام اختیار کرنا پڑا۔ حامد اپنی کلاس میں اس طرح کا اکیلا لڑکا نہیں تھا بلکہ اس کی پوری کلاس ہی اس طرح کے کام کرنے والے بچوں سے بھری پڑی تھی، جو بڑی بے صبری سے اسکول کی آخری گھنٹی کے بجنے کا انتظار کرتے اور گھنٹی کے بجتے ہی دمشق کے گلی کوچوں کی طرف روزی کی تلاش میں دوڑ پڑتے اور تاریکی ہونے تک سرگرداں رہتے تاکہ رات کے کھانے کا کچھ انتظام کر سکیں۔ پھر رات گئے وہ اپنے خیموں یا مٹی کے گھروں کی طرف لوٹ آتے جو ان کے پریوار کے افراد سے کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ یہ کہانی بچوں کے ساتھ ساتھ بزرگ پناہ گزینوں اور یہاں تک کہ پیشہ ور افراد کی تکالیف کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اسکول کے استاد کی حاجت مندی اس کے جوتوں میں دکھائی دیتی ہے جو پورا سال گزر جانے کے بعد بھی نئے جوتے خریدنے سے قاصر ہے، یہی نہیں بلکہ خود استاد چند برسوں قبل اسی جگہ پر بیٹھا ہوا پالش کرنے کے لئے جوتے تلاش کر رہا تھا جیسا کی آج اس کا یہ شاگرد کر رہا ہے، جو جھوٹ کے تانے بانے بن کر اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس کہانی میں ہمیں غسان کی اس وقت کی زندگی کی ایک جھلک نظر اتی ہے جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ دمشق میں رہ رہے تھے اور اقوام متحدہ کی ریلیف ایجنسی کی جانب سے چلائے جارہے اسکول میں پڑھا کر اپنا اور اپنی فیملی کا خرچ چلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

۲. چوری کی شرٹ

یہ کہانی جو غسان کی شہادت کے بعد شائع ہونے والے ان کے آخری مجموعے کا عنوان بھی ہے، در حقیقت ان کی ابتدائی کاوشوں میں سے ایک ہے اور اسے انہوں نے سنہ ۱۹۵۷ میں کویت میں مختصر افسانوں کے ایک مقابلے کے لئے لکھا تھا جس میں انھیں پہلا مقام حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی، اور اس کے بعد وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ غسان نے اس کہانی کو اگلے سال شائع کیا جس سے افسانہ نویسی کے میدان میں ان کی حیرت انگیز صلاحیتں لوگوں کے سامنے آئیں اور ادبی حلقوں میں انھیں پہچان ملی۔

یہ کہانی، جو ہمیں کیمپ میں مہاجروں کی زندگی کی جھلک دکھاتی ہے، زندگی کی دو بنیادی ضرورتوں یعنی کھانے اور کپڑے کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے ایک فلسطینی پناہ گزیں بڑی بیچارگی سے اپنے اہل خانہ کو کھانا کھلانے کے لئے آٹا کے حصول میں سرگرداں ہے، اور اپنے بیٹے کو سخت سردی سے بچانے کے لئے ایک قمیض خریدنے کا آرزومند ہے۔ یہ کہانی در حقیقت چوری کی شرٹ نہیں بلکہ چوری کے اس آٹے کے ارد گرد گھومتی ہے جسکا کچھ حصّہ بیچ کر شرٹ خریدنے کی شدید خواہش ہمیں

اس کے کردار کے یہاں دکھائی پڑتی ہے۔ اس میں بہت سے بدیہی اشارے کیے گئے ہیں، مثلا انگریزوں کا فلسطینیوں کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے انھیں پڑوسی ممالک میں حقیر خیموں میں پناہ گزینوں کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور کرنا، اور پھر اقوام متحدہ کے ریلیف فنڈ کے ذریعے آٹا تقسیم کر کے ان کی بھکمری کا مذاق اڑانا۔ مدرسے کے ایک استاذ کی زبان سے ادا ہونے والا ایک جملہ اس وقت کے انگریزوں کی اس فطرت کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے، اور وہ جملہ ہے "یہ لوگ پہلے تو آدمی کو قتل کرتے ہیں پھر اس کے جنازے میں بھی شریک ہوتے ہیں۔"

غسان نے اس کہانی کے ذریعے یو این آر ڈبلیو اے میں پھیلی ہوئی بد عنوانی کی عکاسی کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کی کیسے سنہرے بالوں والے امریکی ملازمین آٹے کو وقت پر تقسیم کرنے کے بجائے اسے رات کی تاریکی میں خفیہ طریقے سے اسٹور سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں تاکہ اسے بیچ سکیں، اور خیموں میں رہ رہے جن مجبور و لاچار لوگوں کے لئے یہ آیا ہے ان کی کی ہلاکت خیز بھوک کو خاطر تک میں نہیں لاتے۔

اس کہانی میں قوم کے غدّاروں کی طرف بھی اشارہ ہے جو دیر یا سویر اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں۔ ابو سمیر ایجنسی کے سنہرے بالوں والے افسر کے ساتھ سانٹھ گانٹھ کر کے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ غدّاری کرتا ہے۔ وہ اسٹور سے آٹے کی بوریوں کی اسمگلنگ کرنے میں افسر کی مدد کر کے اپنے ہم وطنوں کو زندگی کی بقا کے لئے ضروری آٹے سے محروم کر دیتا ہے۔ اور اسی لئے جب ابو العبد کو پتا چلتا ہے کہ ابو سمیر امریکی ملازم کا

ایجنٹ اور آٹے کی چوری میں اس کی مدد کرتا ہے جس کی وجہ سے آٹے کی تقسیم میں تاخیر ہوتی ہے تو وہ اسے وہیں قتل کر دیتا ہے اور اس طرح ایک غدّار اپنے کیفر کردار کو پہنچتا ہے۔

۳. اداس سنتروں کی سرزمین

یہ کہانی جو غسان کنفانی کے ایک دوسرے مجموعے کا عنوان ہے، اس مجموعے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اور ہمارے سامنے فلسطینی عوام کی پڑوسی ممالک کی جانب ہجرت کرنے، اپنے مال واملاک کے نقصان، اپنے گھروں کو کھونے، اور ایک آزاد اچھی ومہذب زندگی کے ضائع ہونے کے دکھ درد کی داستان بیان کرتی ہے۔ اس کہانی میں ایک قاری فلسطینیوں کو ان کے گھروں، ان کے شہروں اور ان کے دیہاتوں سے بے دخل کئے جانے کے تجربے سے گزرتا ہے، اور دوسرے ممالک میں پناہ لینے کی ان کی مجبوری کا مشاہدہ کرتا ہے۔ غسان اس کہانی میں اس مقام پر رکتے نہیں ہیں بلکہ آگے بڑھ کر پناہ گزینی اختیار کرنے کے بعد کے مصائب کا بھی تذکرہ کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہمیں غسان کا مارکسی عقیدہ انکے مشہور ناول "رجال فی الشمش" کی طرح نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کی اس کہانی میں مصیبت کی ہولناکی نے راوی کو رب ذوالجلال کی قدرت سے مایوس کر دیا ہے اس لئے وہ کہہ اٹھتا ہے "اب اس میں کوئی شک نہیں کی جس خدا کو ہم فلسطین میں جانتے تھے اس نے بھی وہاں سے نکل کر کہیں اور پناہ لے لی ہے" اور اس طرح فلسطین کے دردناک نقصان میں ایمان بھی ختم ہو گیا، اور تارکین وطن غیر معمولی ذہنی وفکری تبدیلی سے

دوچار ہوئے۔ اس کہانی کے سلسلے میں ایک سیاسی مغالطہ دور کرنے کی ضرورت ہے اور وہ یہ ہے کی اس میں ایک عام یہودی اور صہیونی یا ایک عام یہودی یا اسرائیلی یہودی کے بیچ میں فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے اور ایک یہودی بلا امتیاز دشمن گردانا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے، حالانکہ غسان کی بعد کی کہانیوں میں اسکا لحاظ کیا گیا ہے۔

۴. ممنوعہ ہتھیار

اس کہانی میں ۱۹٤۷ کے نکبہ سے پہلے کے فلسطین کو ایک ایسی جگہ کے طور پر دکھایا گیا ہے جہاں نہ اسلحہ ہے اور نہ ہی اس کے لینے یا قبضے کا امکان ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف گاؤں کے لوگ ایک فوجی کو جو وہاں قیام کے غرض سے آتا ہے، مشکوک اور خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہیں، وہیں ایک ادھیڑ عمر شخص اَبو علي اس فوجی کی بندوق چھیننے کی جرأت کرتا ہے مگر جب اس کی بندوق کو لیکر بھاگتا ہے تو راستے میں دو جانی دشمن اس سے بندوق کو چھیننے کے لئے متحد اور گھات میں بیٹھے نظر آتے ہیں اور جب وہ مانگنے کے باوجود بندوق ان کے حوالے نہیں کرتا، تو اسے جان سے مار دیتے ہیں اور بندوق حاصل کر لیتے ہیں مگر یہ بات ایک راز رہ جاتی ہے اور اَبو علي کا معاملہ لوگوں کے لئے ایک معمہ بن جاتا ہے۔

۵. کچھ نہیں!

یہ کہانی غسان نے ایک حقیقی خبر کو بنیاد بنا کر لکھی تھی جس میں اسرائیل اور ایک عرب ملک غالباً اردن کی مشترکہ سرحد پر تعینات ایک عرب فوجی اپنے سینئر افسروں کی اجازت کے بغیر سرحد پار مغصوبہ فلسطینی زمین پر قائم اسرائیلی فوجی مرکز پر گولی

چلا دیتا ہے جس میں دو اسرائیلی فوجی مارے جاتے ہیں۔ اس کہانی میں گولی چلانے کے بعد اس عرب فوجی کو اعصاب کا مریض بتا کر اعصابی ہسپتال لے جایا جاتا ہے، جہاں ڈاکٹر اس کے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اعصاب کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس میں ایک ڈاکٹر جب اس فوجی کو ہیڈ ڈاکٹر کے دفتر لے جا رہا ہوتا ہے تو دونوں کے درمیان گفتگو ہوتی ہے جس میں ڈاکٹر اسے یہ بتانے اور اس کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا گولی چلانے کا فعل اس کے اعصاب کے مرض میں مبتلا ہونے پر دلالت کرتا ہے، جب کہ وہ فوجی یہ سمجھتا ہے کہ عرب عہدیداروں کی منطق میں غیر معقولیت ہے اور وہ اسپتال کے ہیڈ ڈاکٹر کے دفتر میں ان کو یہ باور کروانے جا رہا ہے کہ وہ نہیں بلکہ یہ عرب حکام ہیں جو پاگلپن کے شکار ہیں۔

۶. چھ چیل ایک بچہ

"چھ چیل ایک بچہ" غسان کنفانی کی ان کہانیوں میں سے ایک ہے جو سیاست سے ہٹ کر عام موضوعات پر بات کرتی ہیں۔ یہ فلسفہ، نفسیات، اور غسان کے یہاں فکری پیچیدگی پر روشنی ڈالتی ہیں اور وجود کے تعلّق سے سوالات کھڑے کرتی ہیں کیونکہ غسان کنفانی وجودی فلسفے کے نظریات سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں جو مفردات استعمال ہوئے ہیں وہ دل میں ایسی لہر پیدا کرتے ہیں جو بے مقصدیّت اور فضولیت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ کہانیاں انسانوں کی تقدیر کے بارے میں غور و خوض کرنے، اور موت کے مشکل ترین مرحلے سے گزرنے کے لئے صوفیانہ مجاہدے کے تعلّق سے بیداری پیدا کرتی ہیں تاکہ اس خوفناک انجام کو ایک بہتر انسانی

مقدّر کے لئے سرمایہ کے طور پر لیا جائے۔ زیر نظر کہانی ایک ایسے استاد کے بارے میں ہے جو گاؤں کے اسکولوں میں موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ وہ ایک پرانی بس پر سوار ہو کر کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ کیچڑ سے بھرے کچے راستوں سے گزرتے ہوئے تین گاؤں کا سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ راستے میں ایک چھوٹی پہاڑی پڑتی ہے اور اس پر ایک نوکیلی چٹان کھڑی ہے جس کے تعلّق سے سواریوں کے درمیان طرح طرح کے قصّے مشہور ہیں۔

۷. بیڈ نمبر ۱۲ کی موت

یہ کہانی غسان کی ان کہانیوں میں سے ایک ہے جن میں عالمی پیمانے پر انسانی مشقتوں اور تکلیفوں کے مظاہر پیش کے گئے ہیں۔ اس میں خاص طور سے کویت میں رہ رہے محنتی تارکین وطن کی زندگیوں کی ایک جھلک دکھائی گی ہے۔ یہ کہانی غسان کے پہلے مجموعے کا عنوان ہے اور اسے انہوں نے سنہ ۱۹۶۰ میں لکھا تھا۔ یہ دو کہانیوں سے مرکب ہے، ایک کا تعلّق خیال سے ہے اور دوسرے کا حقیقت سے۔ اسے ایک خط کی شکل میں لکھا گیا ہے جس میں اسپتال میں زیر علاج ایک مریض ایک دوست کو اپنے اس پڑوسی مریض کے بارے میں خط لکھتا ہے جو بیڈ نمبر ۱۲ پر صاحبِ فراش تھا اور بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے انتقال کر گیا۔

یہ کہانی وجود اور معاشرتی نقل مکانی یا بے گھر ہونے کے موضوع کے گرد گھومتی ہے۔ اس میں ایک طرف راوی جو اسپتال میں زیر علاج ہے اپنے پڑوسی بستر نمبر ۱۲ کے مریض کی دردناک موت کی وجہ سے ذاتی الجھن کے بحران سے گزرتا ہے تو دوسری

طرف اس کی زندگی کی ایسی کہانی اپنے دوست کو خط میں لکھ کر بھیجتا ہے جسے وہ خود تخلیق کرتا ہے، اور جو انتہائی حقیقت پسندانہ ہے اور اس میں کسب معاش کی راہ میں وطن ترک کرنے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ موت اس کہانی کا مرکزی مسئلہ ہے کیونکہ یہ موت کے بارے میں فلسفیانہ نظریہ پیش کرتی ہے اور اسی کے تذکرے سے ہی اس کی شروعات ہوتی ہے۔ راوی اس میں موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ایک تلخ تجربے کی طرح محسوس کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ زندگی جینے کی خواہش بھی رکھتا ہے، اور اس طرح اس کہانی میں موت اور زندگی کو ایک ساتھ جمع کر کے دو متضاد چیزوں کو جمع کرنے کی کوشش کی گی ہے، اور یہ بتانے کی کوشش کی گی ہے کہ موت کا مسئلہ نہ صرف موت کا مسئلہ ہے، بلکہ زندگی کا مسئلہ بھی ہے، اور ان لوگوں کا مسئلہ بھی ہے جو ابھی بقید حیات ہیں اور جلد یا بدیر اپنی باری کے منتظر ہیں۔ اس کہانی کے اہم ترین بنیادی عناصر جو انسانیت کے تعلق سے غسان کے نظریے کو نمایاں طریقے سے پیش کرتے ہیں وہ جگہ، وقت، اور موت کے عناصر ہیں، اور اس ناحیے سے اس میں ہمیں غسان کی اس وقت کی زندگی کی ایک جھلک دیکھنے کو ملتی ہے، وجب وہ اپنے وطن سے دور تھے، ذیابیطس جیسے مہلک مرض کا شکار تھے اور اور معاش کے لئے سرگرداں بھی۔

اس مجموعے میں شامل کہانیوں کے مندرجہ بالا تجزیہ کا مقصد یہ تھا کہ قارئین کے سامنے ان کہانیوں کا پس منظر آجائے تاکہ ان کہانیوں کا موضوع، ان کی آفاقیت اور ان کا پیغام سمجھنے میں آسانی ہو۔ میرے علم کی حد تک غسان کنفانی کے اوپر ابھی تک

اردو میں کوئی کام نہیں ہوا تھا باوجودیکہ ان کا ادب عالمی پیمانے کا سمجھا جاتا ہے اور دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں اس کا ترجمہ منظر عام پر آچکا ہے۔ عزیز من ڈاکٹر محمد علی اختر نے اپنی اس پر خلوص کوشش کے ذریعے عالمی ادب کے اردو تراجم کی فہرست میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، اور قارئین کے لئے فلسطینی ادب کے ایک گراں بہا خزانے سے آشنا ہونے کے لئے ایک دریچہ کھول دیا ہے۔ یہ ترجمہ بہت شستہ اور سلیس زبان میں ہے اور ایسی روانی ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ادب کو اس کی حقیقی زبان میں نہیں بلکہ اسکا ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس کام کو قبولیت عطا فرمائے، اور علم وادب کی مزید خدمت کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

کیک فروش

عربی عنوان: كعك على الرصيف

کیا یہ محض ایک انوکھا اتفاق تھا کہ آج بھی مجھے وہ ٹھیک اسی جگہ اکڑوں بیٹھا ہوا ملا جہاں پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا؟ آج بھی وہ اسی ہیئت میں بیٹھا تھا، مانو تب سے آج تک وہ اس پوزیشن سے ہلا بھی نہ ہو۔ کالے کھردرے بال، کسی محروم تمنا سے چمکتی آنکھیں، جو ایک چوبی بکسے کے اوپر رکھے کسی رئیس کے جوتے پر ٹکی تھیں۔ اس کی شکل دیکھتے ہی مجھے گزشتہ سال کا وہ وقت یاد آگیا جب میں نے اسے اسی کونے میں بیٹھا پایا تھا۔ اس یادداشت کی کوئی اور خاص وجہ نہیں، بلکہ میں خود اس کی وجہ تھا۔ دراصل دس سال پہلے میں خود اس کونے میں بیٹھا لوگوں کے جوتے پالش کرتا تھا۔ ہمارے لئے وہ وقت بڑی مشکلات سے بھرا تھا... میرا بھی پالش کا طریقہ بڑی حد تک اس کے طریقے کے مشابہ تھا... اس

زمانے میں یہ جوتے ہی میری کل کائنات ہوا کرتے تھے... جوتے کی نوک اور ایڑی زندگی کے دو کنارے تھے جن کے درمیان میری پوری دنیا سمٹی تھی۔

— 'صاحب! لایئے میں آپ کا جوتا آئینے کی طرح چمکا دوں'، سال بھر پہلے جب میں یہاں سے گذرا تھا اس کی نظر میرے جوتوں پر پڑی تھی اور اس کے ہونٹوں سے مشینی انداز میں یہ الفاظ نکلے تھے۔

دلچسپی اور تجسس کے ایک خاص احساس کے تحت، جو میرے کئی طویل مہینوں کی افسردگی کا مداوا بن گئی، میں نے اپنا جوتا بکس کے اوپر بنے کوہان پر رکھ دیا۔ پسینے کی ایک لمبی لکیر پشت پر اس کی شرٹ کو تر کر رہی تھی۔ اس کے پتلے چھوٹے بازوؤں کی مچھلیاں سکڑ پھیل رہی تھیں، اور سر ایک لے میں مسلسل حرکت کر رہا تھا۔

— 'سر، آپ کا جوتا سستا والا ہے'۔

مجھے خراب نہیں لگا۔ کسی کے سستے جوتے دیکھنے پر میرے اندر بھی اسی طرح کا احساس پیدا ہوتا تھا، لیکن میرے اندر اس احساس کو اتنی سادگی سے بیان کرنے کا سلیقہ نہیں تھا۔ سستے جوتے مجھے اپنے اور دنیا کے درمیان ایک مبہم سی قربت کا احساس دلاتے تھے۔ بہر حال میں نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا:

— 'کیا عمر ہو گی تمہاری'؟

— '۱۱ سال'۔

— 'فلسطین سے ہو'؟

کچھ بولے بغیر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے لگا جیسے وہ شرمندگی کا احساس چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

— 'کہاں رہتے ہو'؟

— 'کیمپ میں'۔

— 'والد کے ساتھ'؟

— 'نہیں، والدہ کے ساتھ'۔

— 'پڑھتے ہو'؟

— 'جی'۔

انگوٹھے سے اس نے جوتے کو ٹھوکا، اور اپنی شفاف آنکھیں مجھ پر مرکوز کر دیں، اس کی چھوٹی ہتھیلیاں میری طرف پھیلی تھیں۔ مجھے اپنے حلق میں کرب کا موٹا گولا پھنستا محسوس ہوا... میں دو متضاد کیفیتوں میں گھر گیا تھا... صرف اس کی مزدوری دوں یا کچھ اضافہ کر کے؟ مجھے میری محنت کے بقدر اجرت ملتی تھی تو اپنے کام پر فخر کا احساس ہوتا تھا، لیکن اگر کوئی اجرت سے زیادہ دینے کی کوشش کرتا تو میں لینے سے صاف منع کر دیتا۔ اس وقت اضافی اجرت ملنے سے خوشی سے زیادہ اہانت کا احساس مجھے گھیر لیتا تھا۔

اگلے موڑ پر میں اس کی نظروں کی زد سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی محنت کے بقدر ہی میں نے اس کو اجرت دی تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ میری طرف سے نظر پھیر چکا تھا اور سڑک پر کسی اور جوتے کی تلاش میں تھا۔

حمید کے ساتھ میرا تعلق اسی منظر کے ساتھ ختم نہیں ہوا۔ اس واقعے کے ایک مہینے بعد ہی میرا تقرر پناہ گزینوں کے ایک اسکول میں بطور معلم ہو گیا۔ پہلے ہی دن جب میں کلاس میں داخل ہوا مجھے وہ پہلی لائن میں بیٹھا نظر آیا۔ کالے کھردرے بال پہلے سے چھوٹے ہو گئے تھے۔ ایک پرانی پھٹی شرٹ بدن چھپانے کی اس کی ناکام کوشش کا حال بیان کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی ایک ناکام تمنا کی جھلک تھی۔

مجھے اطمینان ہوا کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔ ایک جوتا پالش کرنے والا اپنے سیکڑوں گذرتے گاہکوں کو کہاں یاد رکھ سکتا ہے۔ پھر میں دل سے چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھول چکا ہو۔ اگر مجھے وہ پہچان لیتا تو کلاس میں اسے کچھ ہچکچاہٹ ضرور محسوس ہوتی۔ اپنی پوری پہلی کلاس میں اس کے چہرے کی معصومیت اور قلق سے بھری بے تابی سے نظر ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ کلاس میں حمید کے جیسے بہت سے بچے تھے، جو بے صبری سے چھٹی کی گھنٹی کا انتظار کر رہے تھے، تاکہ اتھاہ دمشق کی بے شمار بھول بھلیاں جیسی گلیوں میں پھیل جائیں، اور شام کے اندھیروں کو پچھاڑ کر رات کے کھانے کا کوئی انتظام کر سکیں۔ آخری گھنٹی کا انہیں بے صبری سے انتظار رہتا، پھر اسکول سے چھوٹتے ہی وہ ٹھنڈے خاکی مائل آسمان کے نیچے بکھر جاتے۔ ہر ایک کا زندگی گذارنے کا اپنا الگ ڈھنگ تھا۔ رات اترتے وہ اپنے خیموں یا کچے مکانوں کی طرف لوٹ جاتے۔ ان خیموں یا

مکانوں میں، ان کا پورا خاندان، پوری خاموشی سے جو کبھی کبھار کسی گھٹتی کھانسیوں سے ٹوٹ جاتی، بھیڑ بکریوں کی طرح رات بھر ٹھسا رہتا۔

کبھی کبھی مجھے لگتا جیسے میں ایسے بچوں کو پڑھا رہا ہوں جو اپنی عمر سے بڑے ہو چکے ہیں، بہت بڑے...۔ ہر ایک ان میں سے ایسا لگتا جیسے ایک چنگاری ہو۔ چنگاری جو سنگلاخ زندگی کے سخت چٹان پر ان کی صبر آزما شب و روز کے رگڑ گھانے سے نکلی ہو... کلاس میں ان کی آنکھیں ایسے گردش کرتیں جیسے سیاہ رنگوں میں ڈوبی نامعلوم دنیا میں کھلنے والی کھڑکیاں ہوں... انکے باریک ہونٹ ایک دوسرے پر سختی سے ایسے جمے رہتے جیسے کھلنے کے لئے بالکل تیار نہ ہوں، اس ڈر سے کہ کہیں ان سے نازیبا کلمات کا طوفان نہ نکل پڑے جس پر وہ قابو نہیں پا سکتے۔ وہ کلاس صحیح معنوں میں ایک چھوٹی سی دنیا تھی، تہہ بہ تہہ بد نصیبی و بدحالی کی دنیا، مگر بہادری و جانبازی کی دنیا۔ مجھے ان کے درمیان ایک اجنبیت کا احساس ہونے لگا اور اسی احساس کے تحت میرے اندر یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ کیوں نہ میں ان کے دلوں تک پہونچنے کی کوشش کروں!

حمید ایک متوسط ذہانت کا بچہ تھا، لیکن وہ پڑھنے میں بالکل دل نہیں لگاتا تھا۔ میں نے بارہا اس کے اندر پڑھائی سے رغبت پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

— 'حمید! کبھی گھر میں کتاب کھول کر دیکھنے کی توفیق ہوتی ہے؟ مجھے تو لگتا ہے تم کبھی اپنا سبق دہراتے ہی نہیں'۔

— 'جی ہاں سر'۔

— 'لیکن کیوں؟'

— 'کیونکہ مجھے کام پر جانا ہوتا ہے'۔

— 'اور کب تک کام میں لگے رہتے ہو'؟

اس کی کشادہ غم آلود آنکھیں جھک گئیں، جبکہ اس کی انگلیاں کسی بے چینی کے تحت اس کی گول میلی ٹوپی سے الجھنے لگیں۔

— 'آدھی رات تک سر'، اس نے دکھ سے بوجھل دھیمی آواز میں کہا۔

— 'سنیما گھروں سے نکلتے ناظرین میرا سارا کیک خرید لیتے ہیں، اگر آدھی رات تک میں وہیں بیٹھا رہتا ہوں'۔

— 'کیک! تم کیک بیچتے ہو'؟

— 'جی سر... کیک...'، اس کی ندامت سے بوجھل سرگوشی سنائی دی۔

— 'میں سمجھتا تھا کہ تم....'، 'اچھا رہنے دو... تم اپنی جگہ جا کے بیٹھ جاؤ'۔

رات بھر اس مسکین کا خیال میرے اوپر چھایا رہا.... دمشق کی صاف ستھری سڑکوں پر ننگے پاؤں چکر لگاتے، فلم بینوں کے نکلنے کا انتظار کرتے حمید کا خیال.... میں نے دیکھا اکتوبر کا مہینہ ہے اور آسمان جم کر برس رہا ہے.... حمید

ایک کونے میں کھڑا ایسے لرز رہا ہے جیسے کوئی پنکھ طوفان میں لرزتا ہے.... دونوں شانوں کو پوری طاقت سے ایک دوسرے کی طرف بھینچے، ہتھیلیوں کو اپنے پھٹے کپڑے سے چھپانے کی کوشش کرتے اس کی نظر اپنے کیک کے خوانچے پر تھی.... اس کو انتظار تھا کہ کوئی بھوکا فلم بیں ابھی سنیما ہال سے نکلے گا اور اس سے کیک خریدے گا.... شاید دو لوگ آجائیں.... یا پھر تین.... اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور نگاہیں اکتوبر کے برستے پرنالوں کی طرف اٹھ گئیں۔

دوسرے دن اسے میں نے کلاس میں دیکھا تو نیند سے اس کی پلکیں بوجھل ہوئی جارہی تھیں۔ سر اچانک کبھی لڑھک کر سینے پر گر جاتا جسے وہ بہ سرعت بے بسی سے اوپر اٹھالیتا۔

— 'حمید! کیا تمہیں نیند آرہی ہے؟'

— 'نہیں....! جی نہیں سر'۔

— 'اگر تم سونا چاہتے ہو تو چلو میں تمہیں اساتذہ کے کمرے میں چھوڑ آتا ہوں'۔

— 'نہیں سر، میں سونا نہیں چاہتا'۔

مگر وہ بہت تھکا لگ رہا تھا، اسی لئے میں اسے اساتذہ کے کمرے میں لے آیا ۔ اس کمرے کی دیواریں بالکل سادہ تھیں.... صرف ایک جگہ ڈرائنگ کے کسی ناکام ٹیچر کی بنائی ایک تصویر لٹک رہی تھی، جسے اس نے بچوں کے بچے کھچے

رنگوں سے بنایا تھا۔ ایک چھوٹی میز کے اطراف نمیدہ دیواروں سے لگے بھاری بھر کم صوفے رکھے ہوئے تھے.... میز پر کتابوں اور رجسٹروں کا ڈھیر لگا تھا۔ حمید دروازے پر ہی ٹھٹھک گیا، جیسے کسی اجنبی احساس نے اس روک دیا ہو۔ جھجک کے آثار بھی اسکے چہرے سے عیاں تھے۔ اس کی ٹوپی اس کی انگلیوں میں گھوم رہی تھی اور آنکھیں کبھی مجھ پر اور کبھی کمرے پر ٹک جاتیں۔

— 'کسی بھی صوفے پر سو جاؤ، میں انگیٹھی میں لکڑیاں ڈال دیتا ہوں'۔

وہ سب سے قریب صوفے پر بیٹھ گیا.... اس کی آنکھوں میں مسرت کی ایک چمک سی ابھری تھی۔

— 'رات کیا تم نے ڈھیر سارے کیک بیچے'؟

— 'کچھ خاص نہیں'۔

— 'کیوں؟'

— 'مجھے نیند آگئی تھی.... شو ختم ہونے کا انتظار کرتے کرتے میری آنکھ لگ گئی، اور جب آنکھ کھلی تو سب لوگ جا چکے تھے'۔

— 'سو جاؤ، میں کلاس میں واپس جا رہا ہوں'۔

مجھے معلوم نہیں جیسے تیسے کیسے میں نے کلاس ختم کی.... ایک بے کلی سی مجھ پر طاری تھی.... لگ رہا تھا کہیں بچوں کے سامنے میں کلاس میں ہی نہ رو پڑوں۔

وقفہ میں جب میں واپس آیا حمید گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی چھوٹی ناک ٹھنڈ کی وجہ سے اب بھی زرد تھی، ہاں جون کی گرمی کی رمق دھیرے دھیرے اس کے رخسار تک پہونچ چکی تھی۔ کسی استاذ نے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، ایسے واقعات تو روزانہ کے معمول تھے.... سبھی بس چائے کی چسکیاں لیتے رہے۔

اگلے کچھ دنوں میں اسی تاک میں رہا کہ کیسے میں حمید کی زندگی میں شامل ہو سکوں، وہ بھی اس طرح کہ اسے میری دانستہ کوشش کا علم نہ ہو پائے۔ یہ بڑا مشکل کام تھا، کیونکہ پناہ گزینوں کے اس اسکول کا ہر بچہ اپنے اپنے المیے اور مسئلے کے سلسلے میں بے حد حساس تھا اور اپنے غم و کرب کو سختی سے اپنے سینوں میں دفن رکھتا۔ ان کے درمیان اس سلسلے میں ایک اجماع سا تھا کہ ایسا کرنا ان کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔

ایک دن میرا چھوٹا بھائی میرا لنچ لے کر آیا، اور جب چپراسی نے مجھے بتایا تو میں نے حمید کو بھیجا کہ وہ میرا ٹفن لے آئے۔ حمید جب ٹفن لے کر لوٹا تو اس کے چہرے کے ہاؤ بھاؤ سے مجھے لگ گیا کہ اسے یہ بات بری لگی ہے، اسی لئے لنچ کے وقفے کے دوران میں نے اسے اساتذے کے کمرے میں ملنے کو کہا۔

معمول کی طرح حمید کمرے میں مضطرب سا داخل ہوا۔ میں کمرے میں اکیلا ہی تھا، پھر بھی اس کا اضطراب ختم نہیں ہوا۔ اس کی انگلیاں اب بھی بے

چین اس کی ٹوپی میں الجھی تھیں، اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح چمک رہی تھیں۔

— 'میرا بھائی تمہیں کیسا لگا'؟

— 'میرے بھائی جیسا ہی'۔

میرے گمان میں نہیں تھا کہ اتنی جلدی مجھے یہ موضوع چھیڑنے کا موقع مل جائے گا، اس لئے میں نے جلدی سے استفسار کیا:

— 'تمہارا بھائی؟ میرے علم میں تھا کہ تمہاری صرف دو بہنیں ہیں'۔

— 'جی۔۔ میرا بھائی مر چکا ہے'۔

— 'اوہ'....، اب مضطرب ہونے کی باری میری تھی.... پتہ نہیں اس چھوٹے سے سینے میں کتنے راز دفن تھے۔

— 'تم سے چھوٹا تھا... ہے نا'؟

— 'نہیں، مجھ سے بڑے تھے'۔

— 'کیا ہوا تھا'؟

حمید نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا وہ اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے، لیکن آنسو کے قطرے پلکوں کی باندھ توڑ کر چھلک ہی پڑے، اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے پوری طرح تر ہو گیا، جنہیں مارے شرم کے وہ بار بار پوچھنے کی کوشش کرتا رہا۔

— 'کوئی بات نہیں.... بتانا ضروری نہیں.... تمہیں پتہ ہے کہ میرا بھی ایک بھائی فوت ہو چکا ہے'؟

— 'سچ میں'؟

— 'ایک بڑی گاڑی نے اسے کچل دیا تھا'۔

گو میں جھوٹ بول رہا تھا، لیکن میری بس یہ کوشش تھی کہ کسی طرح اس معصوم کے غموں میں شامل ہو جاؤں۔ میرے جھوٹ نے سیدھے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ دفعتاً ایک اداس سی چمک اس کی آنکھوں میں ابھری اور وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا:

— 'میرے بھائی کو کسی گاڑی نے نہیں کچلا۔ وہ ایک بلڈنگ کی چوتھی منزل پر خادم کے طور پر کام کرتا تھا... بہت خوش تھا'۔ اس کی باتوں کے ساتھ اس کے ہاتھ بھی مسلسل حرکت میں تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے، لیکن اس کو اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

— 'ایک دن لفٹ کی گزرگاہ سے جیسے ہی اس نے نیچے جھانکا، نیچے اترتی لفٹ نے اس کا گلا اڑا دیا'۔

— 'مر گیا'؟

بہت ہی واہیات سوال تھا.... دراصل میرے پورے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا تھا، اس پر قابو پانے کے لئے مجھے اس سوال کے سہارے کی ضرورت پڑی تھی۔

حمید نے سر ہلایا اور پھر اچانک مجھ سے پوچھا:

— 'کیا گاڑی نے آپ کے بھائی کا بھی سر دھڑ سے الگ کر دیا تھا'؟

— 'میرا بھائی؟ آں... ہاں... بعینہ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا'۔

— 'آپ کو بہت دکھ ہوتا ہو گا نا'؟

— 'بالکل'۔

— 'کیا آپ بھی روتے ہیں جب اس کی یاد آتی ہے'؟

— 'بہت زیادہ نہیں'۔

— 'ایک بات بتایئے کیا آپ کے والد باحیات ہیں'؟

— 'یقیناً، میرا مطلب ہے ہاں... کیوں'؟

وہ میری طرف بڑھا اور اشتیاق سے لرزتے ہوئے پوچھا:

— 'کیا وہ بخیر و عافیت ہیں؟'

— 'ہاں، کیوں؟'

اچانک سے اس کی آنکھوں میں درد کا کثیف سا گولہ ابھر آیا.... مجھے اس میں کسی ایسے المیے کی دلسوز کہانی نظر آئی جس سے اس کا جگر چھلنی تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ بھی یقین کی حد تک معلوم تھا کہ وہ اس سلسلے میں میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔ اس کے ہونٹ ایک دوسرے پر مضبوطی سے جم

گئے تھے.... آنکھیں خالی دیوار پر گڑی تھیں۔ اس کی پینٹ چھوٹی اور جگہ جگہ سے پھٹی تھی اور شرٹ نہایت بوسیدہ اور تار تار تھا۔ مجھے خود کو حیرت سے تکتا ہوا پاکر وہ اپنی بے خودی سے نکل آیا، اس کے چہرے پر سرخی اتر آئی تھی اور انگلیوں کے درمیان اس کی گول ٹوپی کی گردش تیز ہو گئی تھی۔

حمید کے مسائل دھیرے دھیرے میری زندگی پر اثرانداز ہونے لگے تھے۔ اب میں اس کی زندگی میں ایک تماشائی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ میری کلاس سیکڑوں مسائل اور المیوں کی داستان سے بھری تھی، لیکن ان سب میں صرف حمید کی حزن ویاس کی تصویروں سے بھری آنکھیں ہی مجھے متوجہ کر سکیں۔ بس اب حمید کی فکر ہی مجھ پر سوار رہنے لگی تھی۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اسکول کے باہر حمید کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کروں، بلکہ ایک بار تو یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ کیوں نہ میں کسی ایسے طریقے سے اس کی مالی معاونت کر دوں جو کہ نارمل بھی لگے اور جس سے اس کو کوئی سبکی بھی محسوس نہ ہو۔ لیکن میرے سب ارادے وخیال اس کی آنکھوں کے سامنے آکر ڈھیر ہو جاتے تھے، جن میں حزن ویاس کے ساتھ غیرت وخودداری ہمیشہ جھلکتی رہتی تھی۔

پھر کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ جن کی وجہ سے حمید کے معاملے سے میری دلچسپی نہ یہ کہ کم ہونے لگی، بلکہ ایک طرح سے اس ننھی سی جان پر جو تہہ بتہ سر بستہ راز تھی غصہ بھی آنے لگا تھا.... ہوا یوں کہ ایک دن حمید میرے پاس ایک

استاذ کی شکایت لے کر آیا کہ انہوں نے پوری کلاس کے سامنے اسے ذلیل کر دیا۔ غصے سے بپھرتے ہوئے اس نے کہا:

— 'میں یتیم ہوں، نہیں تو میں بھی اپنے والد کو بلا لیتا اور پھر دیکھتا'۔

— 'کیا؟ تمہارے والد وفات پا چکے ہیں؟'

— 'جی'، اس نے سر جھکا کر جیسے شرمندہ لہجے میں کہا۔

— 'تم نے اس بارے مجھے میں پہلے کیوں نہیں بتایا'؟

حمید نے میرے سوال کا جواب نہیں، بس اس کا سر ہلتا رہا۔

— 'اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ہی اپنی فیملی کا خرچ اٹھا رہے ہو'؟

— 'جی، میں ہی گھر چلا رہا ہوں، میری والدہ بھی ریلیف فنڈ ایجنسی کے گوداموں میں جھاڑو پوچھا کر کے کچھ کما لیتی ہیں، لیکن زیادہ خرچ میں ہی اٹھاتا ہوں'۔

تھوڑی دیر کے لئے حمید خاموش ہو گیا، پھر اپنی چھوٹی ہتھیلیوں کو کھولتا بند کرتا کہتا چلا گیا:

— 'میں تین کیک کا پیکٹ دس روپے میں خریدتا ہوں اور پھر ایک ایک پانچ روپے میں بیچ دیتا ہوں'۔

— 'کیا اب بھی فلم ناظرین کا انتظار کرتے کرتے تم سو جاتے ہو'؟

— 'جی نہیں، اب تو میں عادی ہو گیا ہوں'۔

کیا ایک ٹیچر کے لئے یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ کبھی کبھی وہ کسی غریب طالب علم کو پاس کرنے کے لئے جعل سازی کا سہارا لے کر اس کے نمبرات بڑھا دیتا ہے؟ حمید ایک متوسط ذہن کا بچہ تھا، لیکن اس کے نمبرات ہمیشہ اچھے آتے تھے۔ لیکن دوسرے بچوں کے مقابل حمید کے نمبرات بڑھاتے ہوئے مجھے ہمیشہ زیادہ اچھا لگتا تھا جیسے میں انصاف کا تقاضہ پورا کر رہا ہوں۔

بات یہاں نہیں بگڑی۔ مسئلہ اس وقت اٹھا جب مجھے نہ صرف حمید کی باتوں، اس کی حرکتوں، بلکہ اس کے آنسوؤں پر بھی شک ہونے لگا۔ سال کے آخری اَیام چل رہے تھے۔ ایک دن سہ پہر کے وقت جب بہت تیز گرمی تھی کسی طالب علم نے مجھے آکر بتایا کہ اسکول کے چپراسی نے حمید کی جب وہ اسکول کی چہار دیواری پھلانگ کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا، بڑی بے رحمی سے پٹائی کی تھی۔ میں نے چپراسی کو ڈانٹ پلانے کے لئے بلایا، مگر میں اس کے اس یقین سے حیران تھا کہ اس نے حمید کے ساتھ جو کچھ کیا بالکل صحیح کیا۔ تعلیم و تربیت کے سارے رہنما اصول و ضوابط سمجھانے سے بھی جب اس پر کچھ اثر نہیں ہوا تو میں نے اس کی سمجھ کی سطح پر اسی کی زبان میں اس کو سمجھانے کوشش کرتے ہوئے پوچھا:

— 'ابو سلیم، کیا ایک یتیم کو اتنی بے رحمی سے پیٹنا سراسر ظلم نہیں ہے'؟

ابو سلیم سینے پر ہاتھ باندھے میری طرف جھکا اور پھنکارتے ہوئے بولا:

— 'یتیم! اس کا باپ پکا شیطان ہے، پوری دنیا جس سے پریشان ہے'۔

— 'حمید کے والد.... زندہ ہیں؟'، میں نے استعجاب سے پوچھا اور مجھے اسی لہجے میں نخوت سے بھرا وہی جواب ملا:

— 'اس کا باپ پکا شیطان ہے، پوری دنیا جس سے پریشان ہے'۔

مجھے لگا جیسے تذلیل واہانت کے زوردار طمانچے میرے چہرے پر برسنے لگے ہوں۔ انتہائی برا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک بچے نے میری ہمدردی حاصل کرنے کے لئے کتنے سارے جھوٹ گڑھے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے میں نہایت بیوقوف اور ضرورت سے زیادہ نرم دل انسان ہوں۔ وہ سارے نمبرات جو میں نے حمید کے غلط طور سے بڑھائے تھے دانت پھاڑ کے میرے سامنے قہقہے لگا رہے تھے۔

گھر کی طرف چلتے ہوئے پورے راستے ابو سلیم کی باتیں میرے دماغ میں دھمک رہی تھیں، جس کی گونج سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ خود کلامی سے خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ چھوٹے چھوٹے بچے حقیقت میں اپنی عمر سے بہت بڑے تھے۔ غلطی میری تھی کہ میں ان سے بچوں کی سطح کا برتاؤ کر رہا تھا۔ میں نے اس بات کو نظر انداز کر دیا تھا کہ اصل میں وہ بالغ العقل بچے ہیں جو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے کوئی بھی راستہ اپنا سکتے ہیں۔ اپنے استاذ کے ساتھ حمید کا یہ کھیل اس کی نظر میں نیم مدہوش خریداروں کے ساتھ ایک کیک فروش کے کھیل سے زیادہ کچھ نہیں تھا، جس میں خریدار اس سے دو کیک کے بھاؤ میں ایک

کیک خرید لیتے ہیں۔ لاکھ خود کو سمجھانے کے باوجود، اس وقت حمید کے ہاتھوں میں اپنی تذلیل کے شدید احساس سے باہر نہیں نکل پا رہا تھا۔

پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے میرے غصے کو اور بڑھا ہی دیا۔ سخت تکلیف اور رنج کا ایسا احساس مجھے کبھی نہیں ہوا تھا، جس نے میرے پورے بدن کو نچوڑ کر رکھ دیا۔ ایک دن کسی باتونی طالب علم نے مجھ بتایا کہ کیسے حمید کی ماں کئی مہینے پہلے ایک مردہ بچی کو جنم دیتی انتقال کر گئی تھی۔ میں نے خود کو جھوٹ و فریب کی تہہ بہ تہہ ڈھیر کے نیچے دبا محسوس کیا، جسے حمید نے ناقابل تصدیق چالاکی سے میرے اوپر جمع کر دیا تھا۔

شدید گرمی کی اس دوپہر تو میرے صبر کی حد ٹوٹ گئی.... اسکول سے لوٹتے ہوئے کافی دنوں کے بعد میں نے اچانک سے اسے دیکھا تھا۔

کیا یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں نے اسے اسی جگہ بیٹھا دیکھا جہاں میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا؟ پالش کے دھبوں سے اٹے اپنے چوبی بکس کے پیچھے وہ اکڑوں بیٹھا سڑک پر کسی جوتے کے شکار کی فراق میں تھا۔ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اسی جھوٹے کیک فروش کو دیکھ رہا ہوں۔ اپنی تذلیل کا احساس مجھے عود کر آیا تھا۔ جب تک میں فیصلہ کر پاتا کہ میں کیا کروں، میرا ہاتھ اس کے گریبان تک پہنچ کر اسے درشتی سے کھینچ رہا تھا۔

اس کی آنکھیں پوری پھیلی گئیں، جن کی چمک میں ایک اچانک خوف کی چمک بھی مل گئی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں،

لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی۔ میری گرفت سے چھوٹنے کی اس کی سب کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ اس کی خاموشی نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی، میں اسے اور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔

— 'جھوٹے مکار!'

— 'سر!'، اس نے معمول کی طرح انگلی اٹھاتے ہوئے ڈھیلے انداز میں کہا۔ پھر آس پاس بے چینی سے دیکھتے ہوئے کانپتے ہوئے اعتراف کرنے لگا:

— 'ہاں سر، میں جھوٹا ہوں، لیکن میری بات تو سن لیجئے'۔

— 'اب سننے کے لئے کچھ بچا ہے؟'

اس کی آنکھیں سکڑ گئیں، اور مجھے لگا جیسے بس آنسو ٹپکنے والے ہیں۔

— 'ایک بار سن لیجئے سر'، اس کی آواز میں لرزش تھی۔

— 'جھوٹے!.... 'اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہو'.... ایسا ہی مجھ سے کہا تھا نہ تم نے؟'

— 'سر.... میں اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہتا.... میری ماں مر چکی ہیں.... لیکن میں یہ بات سب کو نہیں بتا سکتا.... میری ماں کا جب انتقال ہوا تھا میرے والد نے ہمیں اس بارے میں اپنی زبان بند رکھنے کو کہا تھا'۔

میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں نے فوراً سوال داغ دیا:

— 'کیوں؟'

— 'ان کے پاس تدفین کے لئے بھی پیسے نہیں تھے.... اور وہ حکومت سے خائف تھے....'

میرا ہاتھ میرے پہلو میں لٹک گیا تھا.... آج مجھے اس کی آنکھوں میں جھلکتے اس معصوم اندیشے کا راز معلوم ہوا تھا جو اب تک وہاں چھپا تھا.... لیکن مجھے لگا کہیں وہ پھر مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہا ہے تو میں نے پھر سے چیخ کر لیکن پہلے کے بمقابل نرمی سے پوچھا:

— 'اور تمہارے والد؟.... تم نے تو کہا تھا کہ وہ وفات پا چکے ہیں'؟

اس سے زیادہ تحمل کی طاقت اس کے اندر نہیں بچی تھی.... اس کے آنسو چھلک پڑے تو اس نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا.... میں نے سسکیوں کے بیچ اس کی ہلکی آواز سنی:

— 'نہیں ان کا انتقال نہیں ہوا.... لیکن وہ اپنا دماغی توازن کھو چکے ہیں، پورے دن ننگ دھڑنگ وہ سڑکوں پہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ انہوں نے میرے بھائی کا سر لفٹ سے کٹتے ہوئے دیکھا اور بس اس وقت سے اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھے'۔

— 'ان کا دماغی توازن بگڑ گیا؟'

— 'جی... والد صاحب کے استقبال کے لئے ہی اس نے لفٹ کی خلا سے نیچے جھانکا تھا... والد صاحب نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور سر

پیٹتے ہوئے راستے کی طرف بھاگے اور تب سے بس سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں'۔

مجھے لگا جیسے میں غش کھا کے گر پڑوں گا، میں نے پوچھا:

— 'تم نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ تم کیک بیچتے ہو؟ کیا تمہیں اپنے اس کام سے شرم آتی ہے؟'

حمید کی نظریں نیچے جھک گئیں۔ پھر اس نے اپنی گہری شفاف آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ شرمسار لہجے میں کہا:

— 'نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں واقعی میں کیک بیچا کرتا تھا، بس کل ہی میں پھر سے اِس کام میں لگا ہوں'۔

— 'لیکن کیک بیچ کر تم زیادہ نہیں کما لیتے تھے؟'

— 'ہاں— لیکن...'

اس کا چھوٹا سر پھر سے ہلنے لگا.... یہ اس کی عادت تھی جب بھی اسے کچھ زیادہ شرمندگی کا احساس ہوتا۔ بکس کے اوپر اپنا برش لگاتار بجاتے ہوئے، نظریں اٹھائے بغیر اس نے پھسپھاتے ہوئے کہا:

— 'رات کے آخری پہر مجھے بھوک لگ جاتی تھی اور میں دو تین کیک خود ہی کھا جاتا تھا'۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں اور کیا کروں! پہلے تو یہ خیال گذرا کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوں، لیکن میرے اندر اس کی سکت

نہیں بچی تھی.... اس کا سر جس پر کالے کھر درے بال چمک رہے تھے جھکا رہا۔ بے خیالی سے میں نے اپنا پاؤں اٹھایا اور اسے چوبی بکس کے کوہان پر رکھ دیا۔

دو چھوٹی ہتھیلیاں مہارت سے جوتے پر حرکت کرنے لگیں، ساتھ میں اس کا چھوٹا سر بھی ایک لے میں ہلتا جا رہا تھا۔ پھر وہ بڑی سادگی سے بولا:

— 'سر! آپ نے سال بھر سے اپنا جوتا نہیں بدلا.... یہ وہی سستا والا جوتا ہے!'

✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲

چوری کی شرٹ

عربی عنوان: القميص المسروق

کالے آسمان کی طرف اس نے سر اٹھا کر دیکھا... کوئی کفریہ نازیبا گالی اس کی زبان سے پھسلتے پھسلتے رہ گئی۔ آسمان میں سیام مرمر کی سلوں کی طرح گھنگھور بادل ایک دوسرے پر لدے تھے... گھنے بادل کی ٹکریاں کبھی چھٹ جاتیں اور کبھی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو جاتیں....

آج رات تو یہ بارش تھمنے والی نہیں.... اس کا مطلب ہے آج بھی وہ سو نہیں پائے گا.... پوری رات کدال تھامے اسے نالیاں صاف کرتے رہنا ہو گا، تاکہ کیچڑ اور پانی اسکے خیمے کی طنابوں تک نہ پہونچے۔ بارش کے ٹھنڈے قطروں کی چوٹ پڑتے پڑتے اس کی پیٹھ سن ہو چکی تھی.... بلکہ اس ٹھنڈک میں اب اسے سرور انگیز نشے کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنے خیمے سے دھواں اٹھتے

دیکھا.... اس کی بیوی نے کھانا بنانے کے لئے چولہا جلایا تھا.... اس کی شدید خواہش ہو رہی تھی کہ ان گڈھوں سے اسے نجات ملے تو وہ خیمے میں جاکر اپنی برف ہوتی ہتھیلیوں کو آگ میں ڈالدے چاہے وہ جل ہی جائیں..... دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے درمیان وہ انگارے بھر لینا چاہتا تھا، تاکہ ان پر جمی برف پگھل جائے۔ مگر.... وہ خیمے میں جانے سے ڈرتا تھا.... وہ اس کی آنکھوں کے اس خوفناک سوال سے ڈرتا تھا جو برسوں سے وہیں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا.... نہیں! یہ سردی اس خوفناک سوال سے کم صبر آزما تھی۔

جیسے ہی وہ خیمے میں قدم رکھے گا اس کی بیوی ہاتھوں کو آٹے میں ڈالے، آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پوچھے گی... 'کوئی کام ملا؟.... کیا کھائیں گے ہم!..... فلاں کو کیسے کام مل گیا؟.... فلاں تو وہاں کمارہا ہے...'۔ پھر خیمے کے ایک کونے میں بھیگی بلی کی طرح سمٹے عبد الرحمن کی طرف اشارہ کرے گی اور خاموشی سے سر ہلائے گی..... خاموشی جو ہزار ملامتوں سے زیادہ جاں گسل ہے...

آج بھی اس کے پاس کیا جواب ہے... وہی جو ہر رات وہ سنتی ہے.... 'کیا تم چاہتی ہو کہ میں عبد الرحمن کی مشکلوں کے حل کے لئے چوری کروں'؟ ہانپتے ہوئے اس نے تھوڑا سا کمر سیدھا کیا اور پھر اپنے ٹوٹے کدال پر جھک گیا... اس کی نظریں اپنے سیاہ خیمے پر گڑی تھیں..... کرب کے دل فگار احساس

کے ساتھ اس نے خود سے سوال کیا..... کیا ہو جائے گا اگر وہ چوری کر ہی لے...؟

عالمی ریلیف ایجنسی کا گودام خیموں کے قریب ہی ہے.... اگر وہ ٹھان لے تو یہاں وہاں کسی سوراخ سے آٹا اور چاولوں کے ڈھیر تک پہونچنا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں ہو گا..... یہ ساری رسد کسی کی ملکیت تو ہے نہیں.... کہیں سے یہاں آیا ہے.... ان لوگوں کی طرف سے جن کے بارے میں اسکول کے ایک ٹیچر نے عبد الرحمن کو بتایا تھا کہ وہ پہلے تو قتل کر دیتے ہیں اور پھر خود جنازے میں بھی شریک ہوتے ہیں....

کس کا کیا نقصان ہو گا، اگر میں آٹے کی ایک..دو...یا دس بوریاں ادھر اسے ادھر کر دوں؟ کچھ آٹا میں ان لوگوں کو بیچ دوں گا جو بڑی آسانی سے چوری کا مال سونگھ لیتے ہیں.... اور اس کی بھاؤ تاؤ کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں.... یہ آئیڈیا اس کے دل میں بیٹھ گیا...وہ تیزی سے خیمے کے چاروں طرف نالیاں کھودنے لگا.... اسے جلد سے جلد یہ کام مکمل کرنا تھا..... کیوں نہ وہ آج ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دے.... بارش تیز ہو رہی ہے.... پہریدار کو بھی ایجنسی کے گودام کی حفاظت سے زیادہ خود کو ٹھنڈ سے بچانے کی فکر ہو گی...وہ آج ہی اس منصوبے کو انجام دے گا....

— 'کیا کر رہے ہو ابو العبد؟'

اس نے سر گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ تاریکی میں دور تک پھیلے خیموں کی دورویہ قطار کے درمیان اس نے ابو سمیر کو آتے ہوئے پہچان لیا۔

— 'آٹا کھود رہا ہوں... ک... کیا کہا؟

— 'کیا کھود رہے ہو؟'

— 'ام... میں... وہ میں نالیاں کھود رہا ہوں۔'

ابو سمیر نے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر اپنی بکواس شروع کر دی:

— 'لگتا ہے تمہارے ذہن پر بھی آٹا سوار ہے.... راشن کی تقسیم اگلے مہینے کی دس تاریخ تک ملتوی ہو سکتی ہے.... یعنی ابھی بھی لگ بھگ پندرہ دن اور.... اسی لئے ابھی سے ہی اس کے بارے میں مت سوچو.... ہاں مگر یہ کہ تمہارا ارادہ ایک دو تھیلی ادھار لینے کا ہو...'

ابو سمیر گودام کی طرف اشارہ کر رہا تھا.... اس کے ہونٹوں پر مکروہ سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی.... اپنی مشکل پوزیشن کا احساس کر کے وہ پھر سے اپنی ٹوٹی کدال پر جھک گیا...

— 'لو سگریٹ پیو..... اوہ... اس تیز بارش میں سگریٹ بھی نہیں پی سکتے... بھول ہی گیا تھا بارش ہو رہی ہے.... میری عقل ہی خبط ہو گئی ہے'۔

اس کی باتوں سے ابو العبد کا دم گھٹنے لگا تھا.... اس بدنیت باتونی ابو سمیر سے اسے عرصے سے نفرت تھی۔

— 'اس موسلا دھار بارش میں تم باہر کہاں گھوم رہے ہو؟'

— 'وہ... وہ میں... بس تم سے دریافت کرنا چاہ رہا تھا کہ تمہیں کسی مدد کی ضرورت تو نہیں؟'

— 'نہیں... شکریہ'۔

— 'کیا تم دیر تک اس کھدائی میں لگے رہو گے؟'

— ہاں... دیر رات تک'۔

— میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ نالیاں کھودنے کا کام دن میں ہی مکمل کر لیا کرو.... دن میں تو پتہ نہیں تم خیمہ چھوڑ کر کہاں چلے جاتے ہو!..... انگوٹھیٔ سلیمان ڈھونڈھنے تو نہیں نکل پڑتے؟'

— 'نہیں.... کام ڈھونڈنے جاتا ہوں'، اس نے ہانپتے ہوئے کدال سے سر اٹھایا اور درشتگی سے کہا: 'جاؤ جا کر سو جاؤ... مجھے اپنا کام کرنے دو۔'

ابو سمیر پر سکون انداز میں اس کے قریب آیا... اور اپنی چوڑی ہتھیلی اس کے کندھے پر رکھ کر دبی دبی آواز میں اس سے بولا: 'دیکھو ابو العبد! اگر تمہیں اپنے سامنے کوئی آٹے کی بوری چلتی نظر آئے تو کسی کو اس کے بارے میں بتانا مت۔'

'کیا؟... کیسے؟'، ابو العبد کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی... ابو سمیر اس کے کان میں کہہ رہا تھا، جبکہ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ کمینے سے تمباکو کی اٹھتی بھبھک اس کی ناک میں گھسی جا رہی تھی:

— 'یہاں آٹے کی بوریاہیں جورات کو چل کر وہاں جاتی ہی'۔

— 'کہاں جاتی ہیں؟'

— 'وہاں'

ابو العبد نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی..... لیکن ابو سمیر کے دونوں ہاتھ تو نیچے اس کے پہلو سے لگے تھے...

— 'تمہارا حصہ تمہیں مل جائے گا'، ابو سمیر نے اس کے کان میں کہا۔

— 'کیا کسی سوراخ سے تم وہاں گھستے ہو؟'

ابو سمیر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سرگوشیوں میں اسے بتایا:

— 'آٹے کی بوریاں خود نکلتی ہیں... وہ خود چلتی ہوئی آتی ہیں'۔

— 'پاگل تو نہیں ہو گئے؟'

— 'دھت... بدھو.... تمہیں کچھ پتہ نہیں.... سنو! ہمیں صرف بوریاں نکال کر وہاں لے جانا ہے... پہریدار ہمیشہ کی طرح سارا بندوبست کردے گا.... مجھے آٹا بیچنا بھی نہیں پڑتا.... تمہیں بھی اس کی ضرورت نہیں ہو گی.... ایجنسی کا وہ.... وہ بھورا امریکی افسر.... وہی سب کچھ کرتا ہے...'

— 'حیران کیوں ہو!.... رضامندی سے سب کچھ جائز ہو جاتا ہے... وہ امریکی بیچتا ہے.... کچھ میں لیتا ہوں.... کچھ پہریدار کے حصے میں آتا

ہے... اب تمہیں بھی اس میں حصہ ملا کرے گا..... سب کچھ بس رضامندی سے... کہو کیا خیال ہے؟'

ابو العبد کو احساس ہوا کہ مسئلہ ایک.. دو.. یا دس بوریاں چوری کرنے سے زیادہ سنگین ہے... اسے اس گھٹیا انسان کے ساتھ معاملہ کرتے ہوئے گھن کا احساس ہو رہا تھا... یہ گھٹیا انسان جو پورے کیمپ میں اپنے کمینہ پن کے لئے مشہور تھا۔ لیکن... ساتھ ساتھ یہ احساس بھی اس کے لئے سکون بخش تھا کہ طویل حرماں نصیبی کے بعد کل جب وہ اپنے خیمے میں لوٹے گا تو اس کے ہاتھوں میں عبد الرحمن کے لئے نئی شرٹ اور اس کی ماں کے لئے ضروری لوازمات ہوں گے۔

ان کے چہروں پر کھلنے والی مسکراہٹیں کس قدر اس کے لئے فرحت بخش ہوں گی!... صرف عبد الرحمٰن کی مسکراہٹ کے لئے بھی وہ یہ خطرناک منصوبہ خوشی خوشی انجام دے سکتا تھا۔ مگر... کیا ہو گا اگر وہ ناکام ہو گیا؟ عبد الرحمن اور اس کی ماں کا انجام کیا ہو گا؟

کسی ناخوشگوار انجام کے تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے... جب عبد الرحمن اپنے سر پر جوتا پالش کا صندوق اٹھائے گلیوں میں پھر رہا ہو گا.... اس کے ہاتھوں کے ساتھ ساتھ اس کا چھوٹا سر بھی چمکتے جوتوں پر جھول رہا ہو گا..... بہت ہی بھیانک تصور تھا!

لیکن اگر اس کا منصوبہ کامیاب ہو گیا....! تو پھر عبد الرحمن کی ایک نئی شکل ہو گی.... اسے اپنی بیوی کی آنکھوں سے جھانکتے اس خوفناک سوال کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑے گا.... اگر وہ کامیاب ہو گیا تو ہر بارش کی رات میں ان نالیوں کی جھنجھٹ سے بھی چھٹکارا پالے گا... پھر اس کی زندگی جیسی ہو گی اس کا وہ ابھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

— 'ان بدبودار نالیوں کو اب چھوڑو بھی... ہمیں سورج نکلنے سے پہلے پہلے کام ختم کرنا ہے'۔

ہاں... ہاں... وہ کیوں ابھی تک ان نالیوں میں الجھا ہوا ہے.... عبد الرحمن خیمے کے ایک گوشے میں ٹھنڈ سے کانپ رہا ہو گا... اس کی گرم گرم سانسیں وہ اپنی پیشانی پر محسوس کر رہا تھا..... کتنی خواہش تھی اس کی وہ اپنے بیٹے کو اس کے خوف، بے بسی اور لاغری کے چنگلوں سے آزاد کرا لے... بارش رکنے ہی والی تھی.... بدلیوں کی چادر سے چاند باہر جھانکنے لگا تھا.... ابو سمیر ابھی بھی اسکے سامنے سیاہ ہیولے کی طرح جما تھا... اس کے لمبے پاؤں کیچڑ میں گڑے تھے.... پرانے کوٹ کا کالر کانوں کے اوپر تک اٹھا تھا.... وہ اس کے جواب کے انتظار میں وہیں کھڑا تھا...

اس کے سامنے کھڑا یہ انسان اس کے نئے مگر غیر واضح مستقبل کی بات کر رہا تھا.... اس سے سودا کر رہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ گودام سے آٹے کی بوریاں اٹھا کر کسی جگہ لے جائے جہاں وہ امریکی ہر مہینے آٹے کی ڈھیر پر کھڑے ہو کر

تالیاں بجاتا ہے.... اس بلی کی سی نیلی آنکھوں سے ہنستا ہے جو ایک بے چاری چوہیا کے بل کے سامنے اس پر جھپٹنے کے لئے تیار بیٹھا ہو...

— 'اس پہریدار اور امریکی افسر کے ساتھ کب سے تمہاری سانٹھ گانٹھ چل رہی ہے؟'

— 'تمہیں مجھ سے تفتیش ہی کرتے رہنا ہے یا آگے بڑھ کر آٹے کی قیمت وصول کرنا ہے؟.... وہ امریکی میرا دوست ہے...وہ ہر کام سلیقے کا پسند کرتا ہے....وہ ہمیشہ مجھے وقت پر کام کرنے کی ہدایت کرتا ہے....اسے لیٹ لطیفی بالکل پسند نہیں.... ہمیں بغیر کسی تاخیر کے اپنا کام شروع کر دینا چاہئے'۔

ابو العبد کی آنکھوں کے سامنے پھر سے وہی منظر گھوم گیا... جس میں امریکی آٹے کی بوریوں کے سامنے کھڑا ہے...اس کی نیلی آنکھوں سے آسودگی مترشح ہے...اطمینان اور آسودگی کے جذبے سے سرشار اپنی سفید ہتھیلیاں رگڑ رہا ہے....

اس نے اپنے اندر ایک عجیب سا اشتعال محسوس کیا.....یہ امریکی آٹا بیچ رہا ہے، جب کہ کیمپ کے مکینوں سے کہا جارہا ہے راشن اگلے مہینے کی دس تاریخ تک تقسیم کیا جائے گا....اسے اپنے پورے وجود میں نفرت کی چنگاریاں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئیں....یہ اس کے اس دن کے احساسات کی بازگشت تھی جب وہ گودام سے خالی ہاتھ لوٹا تھا، اور شکستہ آواز میں اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ اب آٹا

دس دنوں کے بعد بانٹا جائے گا..... آہ... اس کے مشقت زدہ چہرے پر ابھرنے والے محرومی کے سائے کس قدر درد انگیز تھے! اس نے اپنے حلق میں گولا سا پھنستا ہوا محسوس کیا تھا... جیسے ہزاروں ہاتھ مل کر اس کا گلا گھونٹ رہے ہوں۔ اس کی خاموش نگاہیں آٹے کی خالی بوری پر تھیں جو اس کے کندھے پر ایسے لٹکا تھا جیسے تختۂ دار سے لٹکی لاش... اس کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ ان دس دنوں میں ان کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہو گی.... عبدالرحمن کو بھی معاملے کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا... تبھی اس کی روٹی روٹی کی رٹ اچانک رک گئی تھی۔

پناہ گزینوں کے اس کیمپ کے ہر خیمے کی پر امید نظریں اسی محرومی اور نامیدی کے کرب سے مرجھا گئی تھیں... کیمپ کے ہر بچے کو روٹی کے لئے اور دس دن کا انتظار کرنا تھا.... تو یہ ہے راشن کی تقسیم میں تاخیر کی وجہ!.... یہ ابو سمیر جو اس کے سامنے سیاہ ہیولے کی طرح جما اپنے سودے بازی کے نتیجے کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا... یہ اور وہ امریکی جو آٹے کی ڈھیر کے سامنے اپنی سفید ہتھیلیوں کو رگڑتے ہوئے نیلی آنکھوں سے ہنس رہا ہو گا...

پتہ نہیں کیسے اس نے کدال اپنے سر کے اوپر اٹھائی اور پوری قوت کے ساتھ ابو سمیر کے سر پر پل پڑا... اسے کچھ بھی احساس نہیں تھا کہ کیسے اس کی بیوی اسے کھینچتے ہوئے ابو سمیر کی لاش سے دور لے گئی....

'اس مہینے آٹے کی تقسیم میں کوئی دیری نہیں ہو گی'، وہ یہی چیخے جا رہا تھا.... اسے بس اتنا یاد ہے کہ جب اسنے اپنے آپ کو کیچڑ سے لت پت خیمے کے

اندر پایا اس نے عبد الرحمن کو اپنے سینے سے چمٹا لیا..... اس کی نظریں اس کے لاغر و زرد چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں... وہ اب بھی اپنے بچے کے چہرے پر نئی شرٹ کی خوشی کے رنگ بکھرتے دیکھنا چاہتا تھا.... مگر...

پھر وہ زار و قطار رونے لگا..

✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲✲

بیڈ نمبر ۱۲ کی موت

عربی عنوان: موت سریر رقم ۱۲

پیارے احمد،

میں یہ خط تمہیں ہی کیوں لکھ رہا ہوں اس کی وجہ جاننے میں ہو سکتا ہے تمہیں کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن وہ وجہ کل سے ہی میرے اعصاب پر سوار ہے۔ کل شام جب میں نے اونچے سفید بیڈ پر اس کا دم نکلتے دیکھا مجھے یاد آیا کیسے تم کسی بات میں مبالغہ پیدا کرنے کے لئے "دم نکلنا" کا محاورہ کثرت سے استعمال کرتے ہو۔ بارہا میں نے تمہیں "ہنستے ہنستے اس کا دم نکل گیا"، "اتنا تھک گیا ہوں کہ بس دم نکلنے والا ہے"، "دم نکلنے تک بھی میری محبت ختم نہیں ہو سکتی" جیسے جملے کہتے سنا ہے۔ ہم سب بھی اس طرح کے جملے بولتے ہیں لیکن تم ہم لوگوں سے زیادہ اس محاورے کا استعمال کرتے ہو۔ اسی لئے جب میں نے اسے جان کنی کے وقت بیڈ

پر سکڑتے سمٹتے دیکھا مجھے تمہارا ہی خیال آیا۔ اس کی لاغر لمبی انگلیاں بیڈ شیٹ کے کناروں کو بھینچتی تھیں، پھر ڈھیلی ہو جاتیں.. اس کی بے نور آنکھیں مجھ پر جمی تھیں.

ایسا کرتا ہوں شروع سے میں تمہیں اس کی کہانی سناتا ہوں۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ یہ دوسرا مہینہ میں اس اسپتال میں گذار رہا ہوں۔ مجھے معدے کے السر کی شکایت ہے۔ سرجن اِدھر معدے میں ایک زخم کو بھرتا نہیں ہے کہ اُدھر ایک دوسرا زخم میرے سر کے اندر پتہ نہیں کہاں سے نکل آتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں احمد، کہ سر کا السر معدے کے السر سے زیادہ سوہان روح ہوتا ہے۔ میرے کمرے کا دروازہ داخلی امراض کے شعبے کی راہداری میں کھلتا ہے اور اس کی کھڑکی سے متصل اسپتال کا چھوٹا سا پارک نظر آتا ہے۔ تکیے پر ٹیک لگائے میں دروازے کے باہر مریضوں کی متواتر آمد و رفت بھی دیکھتا رہتا ہوں، اور کھڑکی کے باہر گوریوں کی مسلسل اڑان سے بھی لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مریض، جو یہاں نشتر کے اطمینان کے تلے موت کو گلے لگانے کے لئے آتے ہیں، جنہیں میں آتے تو قدموں پر دیکھتا ہوں، لیکن جو چند گھنٹوں یا دنوں کے بعد سفید چادروں میں لپٹے ہوئے موت کی ٹرالی پر نکلتے ہیں.... اس سارے ہنگام میں سوالات کی تیزابی بارش جو میرا بدن چھلنی کرتی ہے اسے روک پانے میں خود کو میں بے بس محسوس کرتا ہوں۔

کچھ دنوں بعد میں اسپتال سے ڈسچارج ہو جاؤں گا۔ ڈاکٹروں نے جہاں تک ان سے ممکن تھا میرے معدے کی پیوند کاری کر دی ہے۔ اب میں اس بد صورت سن رسیدہ نرس اور اپنی قوت تجسس کے سہارے چل پھر سکتا ہوں۔ اسپتال نے بس اتنا کیا کہ السر کو میرے معدے سے میرے سر میں منتقل کر دیا ہے۔ یہاں کے علاج سے - جیسا کہ میں نے اس بد صورت نرس کو بھی بتایا- معدے کے زخم کو تو بند کیا جا سکتا ہے، لیکن خیالات کے زخم کو بھرنے کا یہاں کوئی علاج نہیں۔ آہستہ سے ترازو کی طرف لے جاتے ہوئے سن رسیدہ نرس اس دن اتنا ہنسی کے اس کے گندے، آدھے جھڑ چکے دانت باہر نکل آئے۔

بہر حال ہمیں ابھی ان باتوں سے بحث نہیں، مجھے تو موت کے بارے میں بتانا ہے.... موت جو تمہارے سامنے وقوع پذیر ہوتی ہے.... وہ موت نہیں جس کے بارے میں تمہیں سن کر معلوم ہوتا ہے۔ ان دو قسموں کی موت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس فرق کا احساس اسی شخص کو ہو سکتا ہے جس نے کسی انسان کو فنا کی ہولناک کھائی میں گرنے سے بچنے کے لئے اپنی لرزیدہ انگلیوں کی بچی کھچی طاقت سے بیڈ شیٹ کو پوری شدت سے بھینچتے ہوئے دیکھا ہے، مانو کپڑے کی وہ چادر اسے اس شہہ زور سے بچا سکتی ہے جو لمحہ لمحہ اس کی آنکھوں سے زندگی کھینچ رہا ہے.... زندگی جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔

جس وقت اس پر موت کا رعشہ طاری تھا، سارے ڈاکٹر اس کو گھیرے دیکھ رہے تھے۔ میں نے اس کے بیڈ سے لٹکے کارڈ پر نگاہ ڈالی۔ ڈاکٹر اس کو بچانے کی

ناکام کوششوں میں مصروف مجھ سے غافل تھے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر میں اپنے روم سے نکل کر اس کے بیڈ کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ کارڈ پر نام محمد علی اکبر، عمر ۲۵ اور نیشنلٹی 'عمانی' لکھا تھا۔ کارڈ کو پلٹ کر دیکھا تو اس طرف بلڈ کینسر لکھا نظر آیا۔ میری نظر اس کے سانولے لاغر چہرے، خوف زدہ پھیلی آنکھیں اور ہونٹوں پر جم گئی، جو بنفشجی سمندر کی مانند لرز رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گھومیں اور میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئیں۔ مجھے لگا جیسے وہ مجھ سے فریاد کر رہا ہو۔ لیکن کیوں؟ کیا اس لئے کہ میں روزانہ صبح اسے سلام کیا کرتا تھا؟ یا اس لئے کہ اس نے میرے چہرے پر دیکھ لیا تھا کہ میں اس کی پتلیوں میں لرزتے خوف کو سمجھ رہا ہوں؟ مجھے ہی ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر.... بس... سادگی سے مر گیا!

تبھی میرے ڈاکٹر نے مجھے دیکھ لیا اور غصے سے کھینچتے ہوئے وہاں سے دور میرے کمرے تک پہونچا گیا، لیکن ذہن میں پیوست وہ منظر کبھی مجھ سے دور نہیں ہوا... میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

— 'بیڈ نمبر ۱۲ مر گیا'، راہداری سے گذرتی نرس کی جذبات سے عاری آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

میں نے دل میں سوچا کیا محمد علی اکبر کا اپنا نام بھی نہیں رہا؟ وہ اب بیڈ نمبر ۱۲ ہو گیا؟ لیکن مجھے کیا کرنا ہے...؟ کسی ایسے انسان کے بارے میں بات کر کے جس کا نام محمد علی اکبر ہوا کرتا تھا میری کیا غرض؟ اس کو اب کیا مطلب کہ اس کو اس کے نام سے پکارا جائے یا اس کا نام کسی نمبر میں بدل دیا جائے؟ اسے یاد آیا کہ

اسے یہ پسند نہیں تھا کہ پکارتے وقت کوئی اس کے نام کا ایک حصہ بھی حذف کر دے۔

نرس روزانہ صبح اسے آواز دیتی:

– 'کیسے ہو محمد علی؟'

لیکن محمد علی جواب نہیں دیتا، اس لئے کہ اس کا نام محمد علی نہیں بلکہ محمد علی اکبر تھا... اور محمد علی جس کو نرس پکار رہی ہے وہ جیسے کوئی اور انسان ہو۔

اس کی اس ضد کے لئے نرس اس سے چہل بھی کرتیں لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی یہ ضد شاید اُس کے اِس احساس کی پرتو ہو کہ اس کا پورا نام ہی کم سے کم اس کے پاس ایک ایسی چیز ہے جس پر وہ ملکیت کا حق رکھتا ہے.... وہ غریب تھا.. مفلوک الحال... اس سے بھی زیادہ جتنا تم کسی قہوہ خانے میں بھٹکتے اپنے گراں قدر خیال سے تصور بھی کر سکو۔ غربت کے آثار اس کے چہرے، اس کے بازوؤں، اس کے سینے، اس کے کھانے کے انداز، اس کی ہر ہر چیز سے مترشح تھے۔

آپریشن کے بعد پہلی بار میں جب چلنے کے قابل ہوا میں اس کے پاس گیا تھا۔ سر کی طرف سے اس کا بیڈ اوپر اٹھا ہوا تھا، اور وہ عجیب سی بے خیالی میں ڈوبا تھا۔ بیڈ کے کنارے بیٹھ کر تھوڑی دیر میں نے اس سے ہلکی پھلکی گفتگو کی۔ میری نظر اس کے تکیے کے پاس رکھے ایک بوسیدہ چوبی بکسے پر پڑی، جس پر نیم فارسی حروف میں اس کا نام کندہ تھا۔ بکس پٹ سن کی رسی سے مضبوطی سے بندھا ہوا

تھا۔ بکس کے علاوہ اس کے پاس صرف کپڑے تھے جو اسپتال کی الماری میں رکھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے نرس سے اس بکس کے بارے میں پوچھا تھا:

– 'کیا ہے اس بوسیدہ بکس میں؟'

– 'کسی کو نہیں معلوم'، نرس نے ہنستے ہوئے کہا، 'پل بھر بھی وہ اس کو خود سے جدا نہیں کرتا'۔

پھر چپکے سے اس نے میرے کان میں کہا:

– 'ایسے لوگ جن کی ہیئت سے غربت ٹپکتی ہے عام طور سے خزانے چھپا کر رکھتے ہیں، کیا پتہ اس میں اس نے کوئی خزانہ دبا رکھا ہو'۔

جب سے میں اسپتال میں ایڈمٹ ہوا کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا، کسی سے اس کی شناسائی نہیں تھی، اسی لئے کبھی کبھی کچھ مٹھائیاں جو عیادت کرنے والے میرے پاس لے کر آتے تھے میں اسے بھیج دیتا تھا، جنہیں وہ بلا کسی جذبے کے رکھ لیتا۔ اسے آداب شکر بجالانے کی تمیز نہیں تھی جس پر مجھے کبھی کبھی ہلکا غصہ بھی آتا۔

اس کے بکس میں کیا پہیلی چھپی تھی میں نے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ محمد علی اکبر کی حالت دنوں دن بگڑتی جارہی تھی، لیکن اس کے باوجود بکس کے تعلق سے اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، جس پر ایک دن نرس مجھ سے کہنے لگی کہ بکس میں اگر کوئی خزانہ ہوتا تو وہ ضرور اسے بانٹ دیتا، یا اس کے بارے میں کوئی وصیت کر جاتا، بالخصوص جب کہ وہ تیزی سے موت کے قریب

تر ہوتا جارہا ہے۔ کسی چھوٹے موٹے دانشور کی طرح دل میں یہ سوچتے ہوئے میرے ہونٹوں پر ہنسی دوڑ گئی کہ اس عورت کی حماقت کہ کوئی حد نہیں... وہ چاہتی ہے کہ محمد علی اکبر خود سے اس کے سامنے یہ ثبوت پیش کردے کہ اب اس کا خاتمہ یقینی ہے، اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ بکس کو خود سے الگ نہ کرنے کی اس کی یہ ضد دراصل اس امید کو گرفت میں رکھنے کی علامت تھی کہ وہ اس حالت سے نجات پائے گا اور پھر بکس اس کا ہو گا اور وہ بکس کا۔

جب اس کی روح ہڈیوں کے بنجر پنجڑے سے آزاد ہو گئی، میں نے اس کے بکس کو اسی جگہ اس کے تکیے کے کنارے رکھا ہوا دیکھا۔ میں نے سوچا یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بکس کو بھی بغیر کھولے اس کے ساتھ ہی دفن کردیں، لیکن میرے اس خیال کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اپنے کمرے میں واپس آگیا، لیکن پوری رات نیند میری آنکھوں سے آنکھ مچولی کرتی رہی۔ محمد علی اکبر سفید چادر میں لپٹا ہاسپیٹل کے مردہ خانے میں پڑا تھا، لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں میرے کمرے میں بھی بیٹھا مجھے گھور رہا تھا.... وارڈوں میں ٹہل رہا ٹھا.... اپنا بیڈ ڈھونڈھ رہا تھا.... سونے سے پہلے اس کی لمبی لمبی سانسیں لینے کی آواز مجھ تک پہونچ رہی تھی۔ صبح جب سورج کی پہلی کرن درختوں پر پڑی میں اس کے بارے میں اپنی متجسس طبیعت کے لئے ایک پوری کہانی بُن چکا تھا۔

.....

محمد علی اکبر عمان میں واقع 'ابخا' گاوں کے مغربی محلے کا ایک نادار شخص تھا۔ دبلا پتلا ایک سانولا نوجوان جس کی آنکھوں میں حوصلوں کی دمک تھی، لیکن ان حوصلوں کو باہر آنے کا راستہ نہیں پتہ تھا۔ وہ غریب تھا، لیکن ایسے شخص کے لئے غربت کے کیا معنی جس نے غربت کے سوا کچھ دیکھا ہی نہ ہو! ابخا میں سبھی غریب تھے، ویسے ہی جیسے محمد علی اکبر غریب تھا، لیکن ان کی غربت قناعت پسند تھی، پائیدار تھی، ایسی غربت جسے کسی مہمیز کی ضرورت تھی یہ سمجھنے کے لئے غربت اچھی چیز نہیں، اور دنیا میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو 'امیری' کہلاتی ہے۔ اسی لئے محمد علی اکبر کے دو مشکیزے جنہیں اپنے کندھوں پر اٹھائے وہ لوگوں کے گھروں تک پانی پہونچاتا تھا، اس کی زندگی کے ترازو کے دو پلڑے تھے۔ شام کو جب وہ مشکیزے اتار کر رکھتا اسے سب خالی خالی محسوس ہوتا، لیکن صبح مشکیزے اس کے کندھوں سے لگتے تو اسے اطمینان ہوتا کہ اس کی زندگی بلا خوف وخطر ایک ہموار و متوازن اور سیدھے راستے پر گامزن ہے۔

ممکن تھا کہ محمد علی اکبر کی زندگی اسی ہموار و پر سکون دھڑے پر چلتی رہتی، ممکن تھا کہ ایسا ہو، اگر تمدن کی طرح تقدیر نے بھی اس کے گھر کا راستہ نہیں دیکھا ہوتا۔ میرا مطلب ہے کہ جس طرح تمدن عمان کے اس دور دراز علاقہ تک نہیں پہونچا تھا، اس طرح اگر تقدیر بھی نہیں پہونچی ہوتی...! لیکن تقدیر تو وہاں بھی موجود تھی، لہذا یہ بھی ضروری تھا کہ محمد علی اکبر بھی کچھ نہ کچھ اس تقدیر کا مزہ تو چکھے۔

وہ ایک اُمس بھری صبح تھی۔ ابھی سورج چڑھا بھی نہیں تھا، مگر راستے کی مٹی تپ رہی تھی۔ صحرا سے اڑتی اتری ہوا کے جھونکے اس کے چہرے پر ریت مل رہے تھے۔ اس نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ کشادہ کالی آنکھوں والی ایک سلونی لڑکی چھوٹے دورازے سے باہر آئی۔ پھر سب کچھ بہت تیزی سے رونما ہوا: دروازے کے سامنے وہ گنگ سا کھڑا تھا جیسے راستہ بھٹک کر وہاں پہونچ گیا ہو۔ مشکیزے اس کے کاندھوں پر مچل رہے تھے۔ خالی نظروں سے وہ اسے ٹکٹکی باندھے بس دیکھتا رہا... کسی ایسے شخص کی طرح دھوپ کی تمازت سے جسے لولگ گئی ہو۔ اس کے دل نے آرزو کی کاش کہ اس کی آنکھوں میں کوئی جادوئی طاقت آجائے اور وہ اسے گلے لگالے، اپنے سینے سے چمٹالے۔ لڑکی کی نظریں بھی اس کی نگاہوں سے ملیں، ان میں لیکن صرف استعجاب تھا اور کچھ نہیں۔ جب کچھ بولنے کی سکت نہیں جٹا پایا تو مڑا اور مشکیزے سمیت واپس گھر آگیا۔

یوں تو محمد علی اکبر کی طبیعت میں شرم و جھجھک تھی، گھر والوں کے لئے بھی وہ شرمیلا تھا، لیکن اس دن ہمت کر کے اسے پوری روداد اپنی بڑی بہن کو سنانا ہی پڑا۔ اس کی ماں عرصہ ہوا چیچک سے مر چکی تھی۔ اس کے والد معذور، اٹھنے بیٹھنے کے بھی قابل نہیں تھے۔ اس وجہ سے اسے اپنی بہن سے مدد لینی ہی پڑی کیونکہ اسے پورا وثوق تھا کہ اس کی بہن 'سبیکہ' ذہانت اور میانہ روی جیسی اپنی خصوصیات کی بنا پر اس طرح کے مسائل کا حل چٹکی میں نکال سکتی ہے۔ کالے

موٹے لباس میں وہ اس کے سامنے چٹائی پر بیٹھی تھی۔ جب تک محمد علی اکبر نے اپنی کہانی ختم نہیں کرلی وہ چپ چاپ سنتی رہی، پھر اس نے پوچھا:

— 'تو تم چاہتے ہو کہ میں اس کے لئے تمہارا پیغام لے کر جاؤں؟

— 'ہاں، لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟'

— 'کیوں نہیں۔ تم اب جوان ہو چکے ہو اور 'اِبخا' میں ہم سب حیثیت میں برابر ہیں'، اس کی بہن نے بوسیدہ چٹائی سے ایک تنکا کھینچتے ہوئے کہا۔

محمد علی اکبر نے وہ رات بے چینی کے کانٹوں پر گذاری۔ صبح ہوتے ہی وہ سبیکہ کے پاس پہونچ گیا جو کہ اس سے زیادہ بے تاب نظر آرہی تھی۔ دونوں میں طے ہو گیا کہ وہ اب دوپہر میں گھر میں ملیں گے تب سبیکہ اسے نتیجے سے آگاہ کردے گی اور پھر اس کے بعد دونوں کہانی کو انجام تک پہونچانے میں لگ جائیں گے۔

محمد علی اکبر کو ہوش نہیں تھا کیسے مشکیزے اٹھائے گلیوں کی خاک چھانتے اس نے وہ وقت گذارا۔ اس کی نظریں اپنے سائے پر لگی تھیں اور زبان دعا میں کہ وقت میں چکری لگ جائے اور وہ اڑ کر گھر پہونچ جائے۔ بالآخر دوپہر ڈھلے وہ گھر واپس آیا۔ دروازے پر ہی بہن نے اس کا استقبال کرتے ہوئے بتایا:

— 'لگتا ہے اس کی ماں کو اس رشتہ پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن اس بارے میں اس کے والد کی رائے لینا بھی ضروری ہے، اور وہ پانچ دنوں کے بعد ہی کوئی جواب دے پائیں گے'۔

محمد علی اکبر کو گمان غالب ہونے لگا تھا کہ اس کا مطلوب اب اس کے دسترس میں ہے۔ اسی دن سے وہ مستقبل کے افق پر اس دیدہ زیب سانولی دوشیزہ کے ساتھ زندگی کے خیالی جہاں آباد کرنے لگا تھا۔ اس کی بہن سبیکہ کی ہوشمند اور تجربہ کار نگاہ معاملے پر لگی تھی۔ سبیکہ کو بھی کامیابی کا یقین تھا۔ وہ جانتی تھی کہ 'ابخا' میں اس کے بھائی کی شرافت نفسی سب کو معلوم ہے۔ علاوہ ازیں لڑکی کی ماں کی رضامندی اس کے لئے زیادہ اہم تھی کیوں کہ اسے علم تھا کہ ایک عورت اپنے شوہر کے سامنے کوئی بھی آئیڈیا پیش کر کے شوہر کو یہ یقین دلا سکتی ہے وہ گویا اسی کا آئیڈیا ہے۔ اسی لئے سبیکہ اس رشتے کی کامیابی کے سلسلے میں مکمل طور پر مطمئن تھی۔

پانچویں دن سبیکہ لڑکی کے گھر جواب لانے پہونچ گئی۔ مگر لوٹتے ہوئے اس کے چہرے پر نامرادی کا گہرا دکھ چھایا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں کھڑی وہ محمد علی اکبر سے آنکھ نہیں ملا پا رہی تھی، اسے سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہاں سے شروع کرے... ہمت جمع کر کے آخر اس نے کہا:

— 'اسے بھول جاؤ محمد علی'...

محمد علی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے تو چپ چاپ کھڑا رہا تا کہ سبیکہ اپنی بات مکمل کر لے۔ سبیکہ نے بھی اس کی خاموشی کو غنیمت جانتے ہوئے بتانا شروع کیا:

— 'دو دن پہلے ہی اس کے والد جاں بحق ہو گئے، اور جاتے جاتے گھر والوں کو وصیت کر گئے کہ اس کی بیٹی کی شادی وہ تم سے نہ کرائیں'۔

محمد علی اکبر نے سب کچھ ایسے سنا جیسے وہ کسی اور سے بات کر رہی ہو، لیکن وہ پوچھے بنا نہیں رہ پایا:

— 'لیکن آخر کیوں، سبیکہ؟'

— 'اسے کسی نے بتایا کہ تم ایک بدمعاش ہو، جو پہاڑی راستوں پر بکریاں چرا کر پیٹ پالتا ہے اور انہیں غیروں کے ہاتھ بیچ دیتا ہے'۔

— 'ام.... میں؟'

سبیکہ کو اپنے اوپر قابو رکھنا مشکل ہو گیا، اس نے مرتعش آواز میں بتایا:

— 'انہیں لگا کہ تم وہ محمد علی ہو.... غنڈہ محمد علی... تم جانتے ہو اسے؟ لڑکی کے والد کو لگا کہ تم وہی ہو...'

— 'لیکن میں محمد علی نہیں ہوں.... میرا نام محمد علی اکبر ہے، اس نے اس بچے کی طرح کہا جو کسی ناکردہ گناہ سے اپنی برآت کا اظہار کر رہا ہو'۔

— 'دراصل ایک غلطی ہو گئی... مجھ سے... جب پہلی بار میں ان کے یہاں گئی تھی میں نے ان کو تمہارا نام محمد علی بتایا تھا۔ مجھے تمہارا پورا نام محمد علی اکبر بتانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی'۔

محمد علی اکبر کو لگا جیسے کسی نے ایک زوردار تھپڑ اسے مار دیا ہو، اور ابھی وہ لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔ لیکن وہ وہیں کھڑا رہا، اس کی ٹکٹکی سبیکہ پر لگی تھی لیکن وہ اسے دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ غصے نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھی۔ اس نے امید کی ترکش سے آخری تیر نکالا:

— 'کیا تم نے اس کی ماں کو بتایا کہ میں وہ محمد علی نہیں ہوں، بلکہ میرا نام محمد علی اکبر ہے؟'

— 'ہاں بتایا تو... لیکن اس کے باپ کی یہ آخری وصیت تھی وہ اس کی شادی تم سے نہ کریں'۔

— 'لیکن میں محمد علی اکبر.... پنہارا محمد علی اکبر ہوں'۔

کیا فائدہ اب اس اضطراب اور افسوس کا؟ سب کچھ ختم ہو گیا.... اتنی آسانی سے.... بس، ایک لفظ اٹک گیا پورے معاملے میں اور معاملہ دم توڑ گیا۔ مگر محمد علی اکبر اسے اپنے دل و دماغ سے آسانی سے نہیں نکال پایا.... وہ اس کے گھر کے آس پاس بھٹکتا رہتا کہ اس کی دوسری جھلک مل جائے... کس لئے؟ وہ نہیں جانتا.... لیکن اس کی نامرادی نے اس کے سینے میں طیش کا شعلہ بھر دیا تھا، جو رفتہ رفتہ نفرت میں بدل رہا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس نے اس راستے سے گزرنا

بھی اس ڈر سے چھوڑ دیا کہ کہیں طیش سے اس کا سر پھر جائے اور اس کے گھر کی کھڑکیوں پر پتھر نہ برسانے لگے۔

اسی دن سے اسے ضد ہو گئی کہ اسے اس کے پورے نام محمد علی اکبر سے پکارا جائے۔ اگر کوئی اسے صرف محمد یا صرف محمد علی کہہ کر آواز دیتا تو وہ پلٹ کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ضد اس کی عادت بن گئی... یہاں تک کہ اس کی بہن سبیکہ کو بھی اس کو آدھے نام سے پکارنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ محمد علی اکبر کو اب ہر جگہ اس کے مکمل نام سے پکارا جاتا تھا۔

اس کے باوجود اس کے دل کو اطمینان نہیں ملا۔ دن بدن 'ابخا' اس کے لئے اس کے ارمانوں کی تاریک دفن گاہ بنتا جا رہا تھا۔ اس کی بہن اس کی شادی کے لئے مصر تھی لیکن وہ مان کر نہیں دے رہا تھا۔ دولت نام کا کیڑا اس کے سر میں سما گیا تھا۔ ہر ہر چیز سے وہ انتقام لینا چاہتا تھا۔ ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جس کے دم پر پورے 'ابخا' کو اور ان تمام لوگوں کو چیلنج کر سکے جو نہیں مانتے کہ وہ غنڈہ محمد علی نہیں، بلکہ محمد علی اکبر ہے... لیکن دولت اسے ملے گی کہاں؟ تبھی اس نے سمندر عبور کر کے کویت جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ابخا اور رأس الخیمہ کے درمیان پیدل دو گھنٹے کی مسافت تھی، اور رأس الخیمہ سے سمندر کے راستے کویت تک پہونچنے میں تین دن لگتے تھے۔ کسی خستہ شکستہ کشتی کا کرایہ ۷۰ روپیے بنتا۔ کسی طرح اگر ۷۰ روپے کا انتظام ہو جائے تو وہ کویت جا کر ایک نئی زندگی کی شروعات کر سکتا تھا۔ اور سال دو سال بعد جب

عمان لوٹے گا وہ ابخا کی گلیوں میں سنہری کناری لگے سفید، چم چماتا ویسا ہی عبا پہن کر شان سے گھومے گا، جیسا اس نے رأس الخیمہ کے ایک رئیس کو پہنے دیکھا تھا، جب وہ ابخا میں کسی لڑکی کا ہاتھ مانگنے آیا تھا، جس کے جمال کی شہرت اس کے گھر تک پہونچ گئی تھی۔

سفر سچ میں بہت دشوار گذار تھا۔ کشتی جس میں طالع آزماؤں کی بڑی بھیڑ سمائی تھی، جو جنوب سے نکل کر آبنائے کو عبور کرتی شمال میں خلیج کے کنارے کی طرف بڑھ رہی تھی، راستے میں پے بہ پے جان لیوا خطروں سے معرکہ آراء ہوتی رہی تھی، لیکن اولوالعزموں کی اس ٹولی کو جنہیں زندگی کی مشقتوں کو سہنے کی عادت تھی کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ سبھی جھاگ نکالتے اتھاہ سمندر کی سطح پر ڈوبتی ابھرتی لکڑی کے اس ٹکڑے کو بچائے رکھنے کی کوشش میں جی جان سے ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ کویت کے پرسکون بندرگاہ میں ستاتی کشتیوں کے بادبان جب دور سے نظر آنے لگے تو محمد علی اکبر کو ایک نامانوس احساس نے گھیر لیا۔ تصور کی رنگین دنیا سے نکل کر اب اس کا خواب حقیقت کی دہلیز پر پڑا تھا۔ اسے اب نقطۂ آغاز ڈھونڈھنا تھا... پہلا خواب تلاش کرنا تھا... اس پر منکشف ہوا کہ تصورات کی وہ دنیا جو ابخا سے اپنی نفرت کے نتیجے میں اس نے آباد کی تھی، ابخا سے انتقام لینے کے لئے کافی نہیں تھی۔ جیسے جیسے شکستہ کشتی لنگر انداز بڑے بڑے جہازوں سے بچتے بچاتے ساحل کے قریب ہوری تھی، اس کے خوابوں کا محل دھیرے دھیرے زمیں بوس ہو رہا تھا۔ کچھ پل کے لئے اسے

خیال گذرا کہ دولت وثروت کے اس کے لمبے لمبے خواب اس کی اچانک پیدا ہوئی نامرادی کا بس دلاسا تو ہو سکتے تھے، لیکن معقولیت سے کوسوں دور تھے۔ کھچا کھچ بھرے راستے، سخت دیواروں کی عمارتیں، خاکی آسمان، شدید تپش، گرم اتری ہوا، گاڑیوں سے اٹی سڑکیں، گم سم چہرے... یہ سب اسے لگا جیسے اس کے خوابوں کا راستہ روکے کھڑے ہوں۔ بے خودی کی حد تک بربادی کے گہرے احساس تلے لوگوں کی بھیڑ میں وہ بلا منزل چلا جا رہا تھا۔ یقین کی حد تک اسے گمان ہو رہا تھا کہ چہروں کی وہ بھیڑ جو اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ بھی نہیں رہی اس کی اصلی دشمن تھی... وہی لوگ، سب کے سب، اس کے خواب کے حقیقت میں بدلنے کے راستے میں پہلی رکاوٹیں تھے... یہاں کی کہانی کا پلاٹ ابخا کی کہانی کی طرح سادہ نہیں تھا... یہاں کی کہانی میں کوئی آغاز نہیں تھا، کوئی انجام نہیں تھا، اور نہ ہی اس کا کوئی رنگ روپ تھا... اسے لگا وہ تمام راستے جن کی وہ خاک چھان رہا تھا ان کا کوئی چھور نہیں تھا... وہ سب ایک چہار دیواری کے گرد گول گول گھوم رہے تھے۔ اس چہار دیواری کے دائرے میں سب کچھ سمایا تھا۔ شام ڈھلے جب کوئی راستہ اسے ساحل تک پہونچا گیا اور دوبارہ اس نے سمندر کو دیکھا، وہ دیر تک پانی سے بغلگیر دور افق کو گھورتا رہا۔ ابخا افق کے پار سکون کی چادر میں لپٹا کسی نہ کسی حال میں جیز وجود میں تھا... اس کا ہر محلہ کسی جگہ سے شروع ہوتا تھا اور کہیں پہ ختم.. اس کی ہر دیوار کا اپنا رنگ وروپ تھا... ابخا بہر کیف اس کے دل کے قریب تھا... اسے لگ رہا تھا کہ کھولتے پانی کے بھنور میں اس کا وجود ڈوب چکا

ہے... جب اس نے انگلیوں سے کھارے پانی کے قطرات صاف کئے جو اس کے گال پر لڑھک آئے تھے، زندگی میں پہلی بار اسے کسی شرم کا احساس نہیں ہوا۔

محمد علی اکبر اس دن بلا جھجھک رویا... جوانی کی چوکھٹ پر قدم رکھنے کے بعد شاید وہ پہلی بار رویا تھا... بے ارادہ ہی اسے اپنے مشکیزے کی یاد شدت سے ستانے لگی تھی... ابھی بھی اس کی نظریں افق پر لگی تھیں... شب کی سیاہی پل بہ پل اس کے آس پاس اپنا پر پھیلا رہی تھی... تو اسے بھی کچھ کچھ لگنے لگا تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی زمانے میں موجود ہے، اور وہ رات بھی ابخا کی رات ہی کی مانند ہے... لوگ اپنے اپنے گھروں میں محو خواب ہیں... سڑکوں پر تھکن اور سناٹا پسرا ہے... سمندر چاندنی میں جھاگ اگل رہا ہے... اسے کسی قدر سکون محسوس ہوا... وہ ہنسنا چاہ رہا تھا لیکن ہنس نہیں سکا تو پھر سے رونے لگا...

****

صبحِ نو امیدِ تازہ کا پیام لے کر آئی... وہ پھر سے سڑکوں کی خاک چھاننے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اتنا تو اندازہ تھا کہ پہلے اسے کسی ایسے انسان تک ہونچنا ہے جو عمانی ہو، جس سے وہ باتیں کر سکے... جلد یا دیر وہ ایسے کسی شخص کو ڈھونڈھ نکالے گا.. تبھی وہ جان پائے گا کہ اسے کہاں قدم رکھنا ہے.. کہاں سے شروعات کرنی ہے..

کسی طرح محمد علی اکبر کو ایک سرکاری ادارے میں چپراسی کی نوکری مل گئی۔ اسے ایک سائیکل بھی دی گئی جس پر وہ ادارے کے کام کاج نپٹاتا تھا۔ اسی سائیکل پر سے سڑکوں کے خط وخال اور دیواروں کے معانی اس کے لئے واضح

ہونے لگے.. اسے کچھ کچھ مانوسیت محسوس ہونے لگی... اس مانوسیت کے پس پردہ مگر یہ دل گیر احساس اس پر چھایا رہتا کہ اس کی بہن سبیکہ کی آنکھیں، اس دوشیزہ کی کھڑکی کے جھروکے، غنڈہ محمد علی جس نے پتہ نہیں کہاں سے ٹپک کر اس کی زندگی کو ٹریجڈی میں بدل دیا تھا اس کے تعاقب میں لگے ہیں۔

سائیکل کے پہیوں کی طرح ماہ و سال کی چرخی گھومتی رہی... دولت کا آنا شروع ہو چکا تھا... اپنی محدود جمع پونجی کی وہ جی جان سے حفاظت کرنے لگا کہ مبادا کسی وقتی خبط کے زیر اثر اسے خرچ نہ کر دے، یا کوئی لفنگا اسے اڑا نہ لے جائے... یہیں سے اسے ایک چھوٹا مضبوط چوبی بکس بنانے کا خیال آیا تاکہ اس کی جمع پونجی اس میں محفوظ رہے.

لیکن محمد علی اکبر کی جمع پونجی کیا تھی؟ ایسی چیز پیسوں سے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا... جب محمد علی اکبر کے پاس ایک خاص مقدار میں پیسے جمع ہو گئے تو اس نے سنہری کناری والا ایک سفید چمکتا عبا خرید لیا.. ہر شام جب وہ بکس کے ساتھ تنہائی میں ہوتا، احتیاط سے تہہ کیا عبا نکال کر اپنی پتلی سانولی انگلیاں شفقت سے اس پر پھیرتا... آنکھوں کے سامنے پھیلا کر اسے نہارتا... اپنے چھوٹے چھوٹے خواب اس پر پسارتا... اس کی کناریوں میں اسے گاؤں کی سڑکیں نظر آتیں... لکڑی کے جنگلوں سے بنے کھڑکیوں سے گاؤں کی الھڑ دوشیزائیں جھانکتی نظر آتیں... وہیں عبا کے ایک کنارے میں اس کا ماضی خود میں سمٹا پڑا تھا... ماضی جو لوٹ کر نہیں آسکتا... لیکن جس کی موجودگی ضروری

ہے... کیونکہ اس کے ہونے میں ہی عبا کی حقیقی معنویت پنہاں تھی... سوکھی انگلیوں سے عبا کو پھر سے محبت سے تہہ کرتا اور اسے صندوق کی حفاظت کے حوالے کر دیتا... انہی کمزور انگلیوں سے پٹ سن کی ایک مضبوط دھاگے سے اسے باندھ دیتا... اور تب جا کر اسے آرام کی نیند آتی..

اس کے علاوہ بکس میں سبیکہ کے لئے خزف کی بالیاں تھیں... جب وہ ابخا لوٹے گا تو اسے پہنائے گا.. تیز خوشبو والی عطر کی ایک شیشی تھی... اور ایک سفید جھولی جس میں نقدی تھی، جسے اپنی وسعت بھر اس نے پس انداز کیا تھا اور جس کے مزید فزوں تر ہونے کی امید لگی تھی..

ان آتے ہیں انجام کی طرف... تو اس کی شروعات ایک شام کو ہوئی، جب وہ سائیکل سے گودام واپس ہو رہا تھا.. اسے اپنے پہلوؤں میں کچھ جلتا سا محسوس ہوا.. یہ سوچ کر وہ پریشان ہو گیا کہ اتنی جلدی اس میں اتنی نقاہت کہاں سے آگئی.. اس نے اس پر زیادہ توجہ نہیں دی.. اس طرح کے دورے اس پر پڑتے تھے جب اسے سبیکہ، اور ابخا کی شدت سے یاد آتی، اور گھر لوٹنے کی شدید تمنا جاگتی۔ بدن میں در آئی نقاہت کے احساس کے ساتھ ساتھ اسے ان تمام چیزوں کی شدت سے یاد آرہی تھی جن سے اس نے کبھی محبت یا نفرت کی تھی، یا جنہیں پیچھے چھوڑ آیا تھا.. جن سے اس کا ماضی عبارت تھا.... یہی سب سوچتے سوچتے محمد علی اکبر اپنی رہائش تک واپس آیا تھا، لیکن دوسرے دن، آدھا دن گذر جانے کے بعد تک بھی نہ تو نقاہت گئی تھی اور نہ اس کا اشتیاق.. جب اس نے بستر سے

اٹھنے کی کوشش کی تو یہ جان کر حیران تھا کہ روزانہ کی طرح علی الصبح اٹھنے کی بجائے آج وہ دوپہر بعد تک سویا رہا تھا.. اس کے لئے مزید پریشان کن یہ بات تھی کہ اب بھی نقاہت اس کی ہڈیوں میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ سہما سا وہ سوچ میں ڈوب گیا.. ایک پل ہی میں اسے لگا جیسے وہ ساحل سمندر پر کھڑا ہو... سطح آب پر منعکس ہوتی سورج کی چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں... پانی سے بھرے دونوں مشکیزے اس کے کندھوں پر تھے... اسے شدید تھکان کا احساس ہو رہا تھا.. سورج کی چکاچوند تیز ہو گئی تھی... اس کے باوجود وہ آنکھیں بند نہیں کر پا رہا تھا.... آنکھیں اس کی جل رہی تھیں.. اور اس سے پہلے کہ اس کے خیالات کا سلسلہ دراز ہوتا وہ پھر سے نیند کی آغوش میں سما چکا تھا..

انسانی فہم کے مطابق زمانے کی حد یہیں تک ہے... لیکن محمد علی اکبر کے لئے سب کچھ اس کے بعد رونما ہوا... گویا وہ زمین سے بلند ہو، اور اس کے پیر بنا کسی سہارے کے تختہ دار پر لٹکے شخص کی طرح نیچے لٹک رہے ہوں... محمد علی اکبر ہی تھا جو لوح وقت کے سامنے رقص کناں تھا، اور لوح بیسالٹ کی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ منجمد تھا... ایک زندہ انسان کی حیثیت سے اس کا کام ختم ہو چکا تھا... اب اس کا رول صرف ایک تماشائی کا تھا.... اسے لگ رہا تھا جیسے کسی بھی چیز سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا... جیسے وہ دور، بہت دور نکل چکا ہو.. اس کے سامنے متحرک ساری چیزیں جیسے شیشے کے ایک بڑے پیالے کے اندر مچھلیاں ہوں.. اس کی پھٹی آنکھیں بھی شیشے کی لگ رہی تھیں...

دوسری بار جب اسے ہوش آیا.. اس نے پایا کچھ لوگ اسے بازوؤں اور پنڈلیوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں... اس میں کوئی سکت نہیں بچی تھی.. لیکن یہ ہوش بچا تھا کہ اس کے پاس ایک قیمتی شئ ہے جسے ساتھ رکھنا ضروری ہے تو نحیف آواز میں اس نے پکارا:

— 'میرا بکس... میرا بکس..'

کسی نے توجہ نہیں دی... تو اس نے خود سے بکس تک پہونچنے کی ایک ناکام کوشش کی... اعضاء میں بچی پوری طاقت سے اس کا جسم پھڑ پھڑایا اور ہانپتے سینے سے کمزور آواز کی دھار نکلی:

— 'بکس!'

اب بھی کسی نے نہیں سنا... لوگ اسے لے کر دروازے تک پہونچ چکے تھے... اس نے چوکھٹ کے بیچ میں لگی لکڑی کو کس کر تھام لیا اور ہانپتے ہوئے اس کے منہ سے سفید جھاگ کی طرح نکلا:

— 'میرا بکس..'

اس کے جسم میں اتنی جدوجہد برداشت کرنے کی قوت نہیں بچی تھی..... نتیجتا پھر سے نیم بیہوشی کی حالت میں چلا گیا... اس بار بھی اس کے سامنے ساحل سمندر کا منظر تھا.. اس بار اسے محسوس ہوا جیسے سمندر کی لہریں اس کے قدموں سے اوپر بڑھتی جا رہی ہیں... پانی نہایت سرد تھا... ہاتھوں سے اس نے کس کر ایک چوکور پتھر کو پکڑ رکھا تھا، جو اسے گہرائی کی طرف کھینچ رہا تھا... اس

بار جب اس کی آنکھ کھلی اس نے دیکھا وہ پٹ سن کی رسی سے بندھے اپنے بوسیدہ بکس کو تھامے ہوئے ہے... چند سفید سائے اس کے سامنے سے آجا رہے ہیں.. اس کے ہاتھ میں ایک نیڈل لگی ہے اور ایک چہرہ اس پر جھکا ہوا ہے...

بہت سے دن گذر گئے... کیا انہیں بہت سے دن کہنا صحیح ہے؟

سچ تو یہ ہے کہ محمد علی اکبر کے لئے کچھ بھی نہیں گذرا... درد کی ستمگری ہر حال میں اس کے ساتھ رہی... درد کے گذر جانے کا احساس اسے کبھی نہیں ہوا.. ہمیشہ درد کے تسلسل اور پائیداری کا احساس اس کے ساتھ ٹھہرا رہا.. سمندر کا منظر کبھی زمین سے لگے لکڑی کے جنگلوں والی کھڑکیوں سے خلط ملط ہو جاتا، کبھی خزف کی بالیوں سے... کبھی کھارے پانی سے ترعبا سے، تو کبھی موجوں کے اوپر خاموش بلا حرکت ٹھہری کشتی سے.. اور کبھی لکڑی کے بوسیدہ بکس سے...

صرف ایک بار اسے باہری دنیا سے کسی تعلق کا احساس ہوا تھا.. دنیا جو موجود تھی.. نہیں شاید جس کا کوئی وجود نہیں تھا... جب اس نے کسی کو پوچھتے سنا تھا:

— 'اس پرانے بکس میں کیا ہے؟'

اس نے آواز کی سمت دیکھا... نیم خوابیدہ حالت میں اسے سنہرے بالوں والے ایک کلین شیو جوان کا چہرا نظر آیا.. وہ اس کے بکس طرف اشارہ کر رہا تھا..

خرد کے لمحات مختصر تھے... پھر سے وہ چپ چاپ سمندر کے منظر میں کھو گیا تھا... لیکن اس بار اس خوبصورت کلین شیو جوان کا چہرہ بھی اس کے سامنے تھا.. ایک اچانک سی چستی اسے بدن میں سرایت ہوتی محسوس ہوئی.. ہر چیز خود بخود اسے صاف صاف نظر آنے لگی تھی... پہلی بار صاف صاف اس نے آفتاب کو طلوع ہوتے دیکھا.. اسے لگا جیسے اب وہ بستر سے اٹھ کر پھر سے سائیکل چلا سکتا ہے.. ہر چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی تھی: بکس اس کے بغل میں رکھا تھا اور پہلے کی طرح بندھا تھا۔ اس نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھنے کے لئے بدن کو جنبش دی... لیکن یہ کیا سفید سفید اپرن اوڑھے کئی لوگ اس کو گھیرے انہاک سے اسے دیکھ رہے تھے... محمد علی اکبر نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہیں سکا... اچانک اسے لگا جیسے سمندر کی طغیانی اس کے وسط تک پہونچ گئی ہے... اور پانی ناقابل برداشت، ناقابل احساس حد تک سرد ہو گیا ہے... ڈوبنے کے خوف سے ہاتھ بڑھا کر اس نے کسی چیز کو تھامنا چاہا، لیکن ہر چیز اس کے انگلیوں کے نیچے سے پھسل جاتی۔ تبھی اسے اسی کلین شیو گورے نوجوان کا چہرا نظر آیا... وہ اسے گھورنے لگا... اسے ڈر ہوا کہیں وہ اس کا بکس نہ اڑا لے جائے..... پانی کی سطح بڑھتی جا رہی تھی... پانی اتنا بڑھ گیا کہ اس کی نگاہوں سے وہ کلین شیو گورا چہرا چھپ گیا...

— 'بیڈ نمبر ۱۲ کی موت ہو گئی!...'

نرس نے پکار کر کہا... اور میں محمد علی اکبر کی ان آنکھوں سے آزاد نہیں ہو سکا جو مرنے سے قبل مجھ پر ٹکی تھیں... مجھے خیال گذرا کہ محمد علی اکبر، جسے یہ پسند نہیں تھا کہ اس کے نام کے ٹکڑے کئے جائیں، ہاں وہی محمد علی اکبر، بس اگر اسے اپنے بکس کے انجام کا اطمینان ہو جائے... تو وہ اب مان لے گا کہ وہ بیڈ نمبر ۱۲ ہو گیا ہے، بس اگر اسے یہ اطمینان ہو جائے...

یہ، پیارے احمد، کہانی ہے، محمد علی اکبر کی... بیڈ نمبر ۱۲ کی... جو کل شام چل بسا، اور جو اب سفید کپڑے میں لپٹا مردہ خانے میں لیٹا ہے... وہ سانولا نحیف سا چہرا جو میرے معدے کے السر کو میرے سر میں منتقل کر کے چلا گیا... وہ جس کی وجہ سے میں تمہیں یہ خط لکھ رہا ہوں تا کہ پھر کبھی تم میرے سامنے اپنا یہ مشہور ڈائیلاگ مت دہرانا کہ 'ہنسے ہنستے میرا دم نکلنے لگا'۔

<<<<<<<<<<<<

پیارے احمد،

ابھی تک مجھے یہاں سے ڈسچارج نہیں کیا گیا ہے... گرچہ میں روبہ صحت ہوں.. یہ مجھے کیسے معلوم؟ اس کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے... بالکنی میں کھڑے سگریٹ پینے کے بعد میں اپنے بازوؤں کی پوری طاقت سے سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا باہر اچھال دیتا ہوں، جو پارک میں قطار میں لگے ہرے بھرے پودوں کے درمیان جا گرتا ہے۔ گذشتہ کچھ ہفتے سگریٹ کے ٹکڑے چوتھے قطار سے تھوڑا

آگے گرتے تھے.. آج میں نے جو ٹکڑا اچھالا وہ چھٹے قطار کے بہت نزدیک گرا ہے۔

تمہارے خط سے جو میں نے سمجھا وہ یہ کہ تمہیں موت کو سمجھنے کے لئے محمد علی اکبر کی موت کو دیکھنے کی ضرورت نہیں.. تم نے لکھا ہے کہ حادثۂ موت کے لئے دل فگار مقدمات کی ضرورت نہیں ہے، جو آپ نے محمد علی کی زندگی کے بارے میں بیان کی ہیں.. لوگ اس سے بھی زیادہ سادگی سے مرتے ہیں.. مثلا ایک شخص جو فٹ پاتھ سے پھسلا اور اس کی بھری پستول چل گئی، اور گولی اس کی گردن کے آر پار ہو گئی: وہ اپنی خوبصوت محبوبہ کے ساتھ محو خرام تھا.. یا وہ شخص اپریل کی ایک شام جس کی موت راستے میں دل کا دورہ پڑنے سے ہو گئی.. ایک ہفتے پہلے ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ یہ سب اپنی جگہ صحیح ہے، احمد، بالکل صحیح... لیکن مسئلہ یہ نہیں ہے.. موت کا قضیہ مرنے والا کا قضیہ بالکل بھی نہیں ہے.. بلکہ زندہ بچ جانے والوں کا قضیہ ہے... ان لوگوں کا قضیہ ہے جو دلسوزی کے ساتھ اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں، تاکہ وہ بھی زندہ لوگوں کے لئے ایک معمولی سبق بن سکیں..

گذشتہ خط میں جو کچھ میں نے لکھا تھا اس سے میرا مطلوب بس یہ تھا کہ اب ہمیں اپنی فکر و نظر کے زاویے کو نقطۂ آغاز سے ہٹا کر نقطۂ انجام پر مرکوز کرنا چاہئے.. ہماری ہر فکر کا منبع نقطۂ موت ہو... تم کہتے ہو کہ کوئی فرق نہیں ایک ایسے شخص کی موت میں جو اس حال میں مرا کہ وہ ایک خوبصورت دوشیزہ کے

جمال سے لطف کشید کر رہا تھا، اور اس شخص کی موت میں مرتے وقت جس کی نگاہ ایک کلین شیو چہرے پر ٹکی تھی، اس ڈر سے کہ کہیں وہ پٹ سن کی رسی سے مضبوطی سے بندھے اس کے بوسیدہ ہولڈ بکس کو اڑا نہ لے جائے!... قضیہ پھر بھی انجام کا ہی ہے.... نیستی یا دوام کا قضیہ... یا پھر تمہارے نقطۂ نظر سے یہ کس چیز کا قضیہ ہے، پیارے احمد؟

بہر حال چھوڑو ہم کیا چھلنی میں پانی بھرنے بیٹھ گئے.. تمہیں پتہ ہے پچھلا خط تمہیں بھیجنے کے بعد کیا ہوا؟ میں ڈاکٹر کے چیمبر میں گیا جہاں وہ محمد علی اکبر پر رپورٹ تیار کر رہا تھا... اسپتال والے اس کا بکس کھولنے ہی والے تھے.... آہ احمد، کیا بتاؤں ہم لوگ کس قدر اپنے جسم و عقل کے زندان میں محصور ہیں.. ہم ہمیشہ دوسروں کو اپنی خصوصیات کے زاویے سے پرکھتے ہیں... اپنے خیالات اور افکار کی تنگ بینی سے دیکھتے ہیں.. چاہتے ہیں کہ دوسرے، جتنا بھی ہو، ہماری ہی طرح بن جائیں... ہم انہیں اپنا جامہ پہنانا چاہتے ہیں... چاہتے ہیں کہ وہ ہماری آنکھوں سے دیکھیں.. ہمارے ماضی پر فخر کریں... زندگی کا سامنا ہماری طرز سے کریں.. انہیں ہم زمان و مکان کے تعلق سے اپنی موجودہ فہم کی چوکھٹوں میں فٹ کرنا چاہتے.

محمد علی اکبر کے بارے میں ہم نے پہلے جو کچھ بیان کیا وہ اس کے آس پاس بھی نہیں تھا..... وہ تین بیٹے اور دو بیٹیوں کا باپ تھا.. ہم بھول گئے کہ ہمارے یہاں لڑکوں کی شادی جلد ہو جاتی ہے... علاوہ ازیں محمد علی اکبر پنہارا نہیں تھا..

پانی کی عمان میں کوئی قلت نہیں ہے۔ یہاں سکونت اختیار کرنے سے پہلے وہ ایک بادبانی کشتی کا ملاح ہوا کرتا تھا جو خلیج اور جنوب کے بندرگاہوں کے بیچ چلتی تھی۔

محمد علی اکبر چار سال پہلے کویت آیا تھا اور ناقابل تصور جاں گداز جدوجہد کے بعد دو مہینے قبل ہی نئی سڑک کے ایک فٹ پاتھ پر اپنی چھوٹی سی دوکان کھولنے میں کامیاب ہو پایا تھا... عمان میں اس کی فیملی کی گذر اوقات کیسے ہو رہی تھی اس بارے میں ہمیں کچھ نہیں پتہ۔

میں نے ڈاکٹر کی رپورٹ میں پڑھا کہ موت سے ٦ گھنٹے قبل اس کی بینائی جا چکی تھی... اس کا مطلب ہے کہ جانکنی کے وقت وہ مجھے نہیں گھور رہا تھا.. کیونکہ اس کی بینائی اسوقت جا چکی تھی.. رپورٹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ مریض کے گھر والوں کا کوئی پتہ ان کے پاس نہیں تھا.... مطلب اس کی تدفین میں صرف اسپتال کے گورکن ہی شریک ہوں گے۔

ڈاکٹر نے اپنے ساتھیوں کو رپورٹ پڑھ کر سنائی.. رپورٹ مختصر تھی اور میت کے مرض سے متعلق فنی اصطلاحات پر مبنی... ڈاکٹر کے لہجے میں گہری اداسی تھی... رپورٹ پڑھ چکنے کے بعد وہ بکس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی رسی کھولنے لگا... اس لمحے مجھے خیال ہوا کہ میں واپس اپنے کمرے لوٹ جاؤں، کیونکہ اس معاملے سے میرا کوئی سروکار نہیں تھا.. جس محمد علی اکبر کو میں جانتا تھا وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا، اور یہ رپورٹ جس محمد علی اکبر کے بارے میں ہے وہ کوئی

اور ہو گا... یہ بکس بھی کوئی اور بکس ہے.. محمد علی کے بکس میں کیا ہے یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے.. پھر اس نئے مسئلے میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے؟

لیکن.. میں کمرے سے باہر نہیں جا سکا.. اس کے ایک کونے میں کھڑا رہا... مجھ پر ہلکی کپکپی طاری تھی...

جلد ہی بکس کھل گیا... ڈاکٹر نے انگلیوں سے بکس کو جلدی جلدی کھنگالا اور اسے وہیں ڈال دیا..

ڈرتے ڈرتے میں نے بکس میں جھانکا... اس میں اس کی نئی دکان کے لئے سامان فراہم کرنے والے اسٹورس کے بقایا قرض کی رسیدوں کا ایک بنڈل تھا... ایک کنارے کسی باریش شخص کی ایک پرانی تصویر تھی، گھڑی کا ایک پرانا کور تھا، پٹ سن کی رسی تھی، ایک چھوٹی شمع تھی، اور چند سکے کاغذوں کے درمیان بکھرے تھے۔

سچ کہہ رہا ہوں مجھ پر شدید مایوسی کا دورہ پڑ گیا... لیکن کمرے سے نکلنے سے ذرا پہلے جو کچھ میں نے دیکھا اس نے مجھے دم بخود کر دیا... ہوا یہ کہ نرس نے رسیدوں کا بنڈل ایک طرف ہٹایا تو اس کے نیچے سے خزف کی لمبی چمچماتی بالی نکلی... میرا سر چکرا گیا... میں بکس کی طرف بڑھا اور بالی کو اپنی انگلی سے اٹھا لیا... پتہ نہیں کیوں میں نے نرس کی طرف دیکھا اور جلدی سے کہا:

— 'یہ بالی اس نے اپنی بہن سبیکہ کے لئے خریدا تھا... یہ مجھے اچھی طرح پتہ ہے...'

کچھ پل حیرت سے نرس نے مجھے دیکھا اور پھر اس کی ہنسی پھوٹ پڑی...

ڈاکٹر بھی اس لطیفے پر مسکرا دیا..

تم تو جانتے ہی ہو کہ نرسوں کے لئے معدے کے السر میں مبتلا مریض کے ساتھ دلداری کرنا ضروری ہوتا ہے کہ مبادا اس کی کیفیت نہ بگڑ جائے۔

تمہارا بھائی

کویت-۱۹۶۰

اداس سنتروں کی سرزمین

عربی عنوان: أرض البرتقال الحزين

جب ہم یافا سے عکا کے لئے روانہ ہوئے تھے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا... ہمارا یہ سفر ایسے ہی تھا جیسے لوگ ہر سال تہوار منانے کے لئے اپنے شہر سے کسی اور شہر کا رخ کرتے ہیں۔ عکا میں بھی ہمارے اوقات کسی انہونی سے پاک عام دنوں کی طرح گذر رہے تھے... بلکہ اس وقت چھوٹے ہونے کی وجہ سے میں خوب مزے اٹھا رہا تھا، کیونکہ میرا اسکول جانا بند ہو گیا تھا... بہر کیف... جس رات عکا پر وہ بڑا حملہ ہوا، حقیقت میرے سامنے آہستہ آہستہ واضح ہونے لگی... وہ سخت اندوہناک رات مردوں کی دل شکستہ خموشی، اور عورتوں کی غمناک دعاؤں کے بیچ گذری... ہم لوگ - میں تم اور ہمارے ہم عمر بچے- اس وقت اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے کہ از اول تا آخر پورے معاملے کی سنگینی کو سمجھ

سکتے.... لیکن اس رات حقیقتیں ہم پر کھلنے لگیں.. صبح، جب یہود گرجتے برستے واپس جا چکے تھے.. ایک بڑی سی لاری ہمارے گھر کے سامنے کھڑی تھی... یہاں وہاں سے بستر، چادر جیسی معمولی چیزوں کی گٹھریاں جلدی جلدی، ہذیانی انداز میں اس پر لادی جا رہی تھیں.. میں گھر کی ایک بوسیدہ دیوار سے پیٹھ کے بل ٹیک لگائے کھڑا تھا، جب میں نے تمہاری امی کو گاڑی میں چڑھتے دیکھا۔ ان کے پیچھے تمہاری خالہ، پھر چھوٹے بچے تھے۔ تمہارے ابو نے تمہیں اور تمہارے بھائیوں کو اٹھا کر سامانوں کے اوپر ڈال دیا، پھر انہوں نے مجھے میری جگہ سے کھینچا اور اپنے سر کے اوپر اٹھا کر کیبن کے چھت پر ایک لوہے کے کٹھگھڑے میں ڈال دیا ، جہاں میرا چھوٹا بھائی ریاض پہلے سے ہی اطمینان سے بیٹھا تھا... قبل اس کہ میں خود کو آرام دہ پوزیشن میں لاتا، لاری چل پڑی تھی.... پیارا عکا لمحہ بہ لمحہ رأس الناقورہ جانے والی بل کھاتی سڑک کی انگڑائیوں کے پیچھے روپوش ہوتا جا رہا تھا..

آسمان پر تھوڑے بادل تھے... ایک سرد احساس مجھ پر حاوی تھا.. ریاض بالکل چپ تھا.. اس نے پیر کٹھگھڑے کے سرے سے ٹکایا ہوا تھا، اس کی پیٹھ سامانوں سے لگی تھی اور نظر آسمان میں.. میں بھی چپ چاپ گھٹنوں پر ٹھڈی ٹکائے، ہاتھوں سے گھٹنوں کو باندھے بیٹھا تھا.. سڑک سے لگے سنتروں کے باغات پیچھے بھاگے جا رہے تھے... ہم سب خوف کی گرفت میں تھے... لاری بھگے راستے پر دوڑ رہی تھی... دور گولیاں چل رہی تھیں جیسے ہمیں الوداع کہہ رہی ہوں...

دور نیلے افق پر جب رأس الناقورہ کے آثار ظاہر ہوئے، لاری رک گئی...
سامانوں کے بیچ سے اتر کر عورتیں ایک کسان کے پاس گئیں، جو اپنے سامنے سنترے کا ٹوکرا رکھے اکڑوں بیٹھا تھا... انہوں نے کچھ سنترے اٹھا لیے... ان کی ہچکیوں کی آواز ہم تک آرہی تھی... اس وقت مجھے احساس ہوا جیسے سنترا کوئی بہت محبوب چیز ہو... یہ بڑے بڑے شفاف دانے جیسے ہمارے لئے بہت اہم ہوں...! عورتوں نے کچھ سنترے خرید لئے تھے، انہیں لے کر وہ لاری میں واپس آگئیں... تمہارے ابو ڈرائیور کی طرف سے اترے اور ہاتھ بڑھا کر ایک سنترہ اٹھالیا.. تھوڑی دیر چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے، پھر کسی بدنصیب بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگے...

رأس الناقورہ میں ہماری لاری بہت سی اور لاریوں کے بغل میں کھڑی ہوئی... لوگ اپنے اسلحے پولیس کے حوالے کرنے لگے، جو اسی مقصد کے لئے وہاں تعینات تھی... جب ہماری باری آئی، اور میں نے میز پر بندوقوں اور مشین گنوں کا ڈھیر دیکھا، اور بڑی بڑی لاریوں کی قطار کو پیچ دار سڑکوں کو عبور کر کے، سنتروں کی زمین سے دور لبنان میں داخل ہوتے دیکھا، میری بھی ہچکیاں بندھ گئیں.. تمہاری امی اب تک چپ چاپ سنترے کو تک رہی تھی... تمہارے ابو کی آنکھوں میں سنترے کے وہ تمام پیڑ چمک رہے تھے جو وہ انہیں یہودیوں کے لئے چھوڑ آئے تھے... شفاف سنتروں کے وہ تمام پیڑ جنہیں انہوں نے یکے بعد

دیگرے خریدا تھا... سب کے سب ان کے چہرے پر چمک رہے تھے... ان آنسوؤں کی شکل میں جن پر تھانیدار کے سامنے وہ قابو نہیں رکھ پائے تھے....

وقتِ عصر جب ہم صیدا پہونچے ہم پناہ گزیں بن چکے تھے..

☼☼☼☼

دوسروں کی طرح ہمیں بھی راستے نے اپنے آغوش میں بھر لیا... تمہارے ابو پہلے سے زیادہ عمر رسیدہ لگ رہے تھے، مانو مدت ہوئی ان کی آنکھوں نے نیند کا مزا نہیں چکھا..... وہ سڑک کے بیچ زمین پر پڑے سامان کے سامنے کھڑے تھے... اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس وقت میں نے ان سے کچھ کہنے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر مغلظات کے ساتھ برس پڑیں گے: 'لعنت ہو تیرے باپ پر، لعنت ہو تیرے....' یہ دونوں گالیاں ان کے چہرے پر میں صاف صاف پڑھ سکتا تھا۔ بلکہ میں خود... میں، وہ بچہ جس کی پرورش ایک کٹر دینی اسکول کے ماحول میں ہوئی تھی... خود میرے ذہن میں بھی اس وقت شک کے کیڑے رینگنے لگے تھے کہ کیا اللہ واقعی انسان کی بھلائی چاہتا ہے... مجھے شک ہونے لگا تھا کہ اللہ ہر چیز سنتا ہے... اور ہر چیز دیکھتا ہے... وہ رنگ برنگی تصویریں جو اسکول کے کنیسا میں ہمارے درمیان بانٹی جاتیں، اور جن میں خداوند بچوں پر شفقت کرتے ہوئے مسکراتے نظر آتے، وہ سب بھی محض ایک جھوٹ لگنے لگی تھیں، جھوٹ جسے کٹر دینی اسکول چلانے والوں نے زیادہ سے زیادہ فیس اینٹھنے کے لئے گڑھا تھا... مجھے اب کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جس خداوند سے ہم فلسطین میں واقف تھے، وہ بھی

اب وہاں سے کوچ کر چکا ہے.. وہ بھی اب کسی جگہ پناہ گزیں ہے.. وہ اب خود اپنی مشکلات بھی حل نہیں کر سکتا... ہماری کہاں سے کرے گا...، کسی نئے نصیب کے انتظار میں، جس میں ہمارے مسئلے کا حل ہو، فٹ پاتھ پر بیٹھے ہم پناہ گزیں لوگوں کو خود شب گذاری کے لئے کسی چھت کا انتظام کرنا تھا... احساسِ کرب اس معصوم کے سادہ ذہن کو شکار بنانے لگا تھا...

رات خوفناک ہوتی ہے... سیاہیٔ شب نے جو دھیرے دھیرے اپنا پر پھیلانے لگی تھی، میرے دل میں خوف بھر دیا تھا.. صرف اس خیال سے کہ رات یہاں فٹ پاتھ پہ گذرے گی اندیشوں نے مجھے گھیر لیا... اندیشے جو ہیبتناک اور ہوش ربا تھے... کسی کو بھی مجھ سے تسلی کے دو بول کہنے کی فرصت نہیں تھی... کوئی بھی وہاں مجھے اپنے آغوش میں پناہ دینے والا نہیں ملتا.. تمہارے ابو کی خاموش نگاہوں نے میرا ڈر اور بھی بڑھا دیا.. تمہاری امی کے ہاتھ میں سنترہ دیکھ کر میرے سر میں دھماکے ہونے لگے تھے... سبھی چپ چاپ سیاہ سڑک کی تاریکیوں میں گھور رہے تھے، شاید اس امید میں کہ کسی موڑ سے کوئی نصیب ہماری مشکلات کا حل لے کر آجائے، اور ہمیں اپنے ساتھ کسی چھت کی پناہ میں لے جائے۔ ہمارا نصیب اچانک کہیں سے نمودار ہوا.... تمہارے چچا ہم سے پہلے شہر پہونچ چکے تھے... وہی ہمارا نصیب بن کر آئے۔

تمہارے چچا پہلے بھی اخلاقیات پر ایمان نہیں رکھتے تھے، لیکن جب انہوں نے خود کو فٹ پاتھ پر پایا، سرے سے ان کا ایمان ہی اٹھ گیا... انہوں نے ایک

ایسے گھر کا رخ کیا جس میں ایک یہودی خاندان رہتا تھا اور دروازہ کھول کر اس میں گھس گئے، اپنا ساز و سامان رکھا، اور اپنے گول مٹول چہرے سے اس خاندان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فصیح عربی میں کہا: 'تم لوگ فلسطین چلے جاؤ'۔ وہ لوگ فلسطین تو نہیں گئے، لیکن تمہارے چچا کے چہرے سے جھلکتی وحشتناک مایوسی سے ڈر کر بغل والے کمرے میں منتقل ہو گئے، اور اس کمرے کی چھت و فرش کی نعمت تمہارے چچا کے حوالے کر دیا...

تمہارے چچا ہمیں اسی کمرے میں لے گئے... اور مع ساز سامان ہمیں اس میں ٹھوس دیا۔ رات کو ہم فرش پر سو گئے... فرش پورا چھوٹے بچوں سے بھر گیا... اوڑھنے کے لئے ہم نے بڑوں کے کوٹ استعمال کر لئے.. صبح جب ہماری آنکھ کھلی، ہم نے دیکھا کہ مردوں نے کرسی پر بیٹھے رات گذار دی تھی... مشکلات المیہ بن کر ہماری زندگی کی تہوں میں سرایت کرنے لگی تھیں...

صیدا میں ہم زیادہ دن نہیں رہے... تمہارے چچا کے کمرے میں ہم آدھے لوگوں کے لئے بھی جگہ نہیں تھی، پھر بھی تین رات ہم نے وہاں گذاریں... پھر تمہاری امی نے ابو سے کہا کہ یا تو وہ کوئی کام ڈھونڈھیں، یا پھر سنتروں کے باغ لوٹ چلیں... غیظ و غضب سے کانپتی آواز میں تمہارے ابو ان پر چیخنے لگے تھے، تو انہوں اپنے ہونٹ سل لئے... ہماری فیملی مشکلات کا آغاز ہو چکا تھا.... خوش و خرم، باہم شیر و شکر پہلے والی ہماری فیملی، ہماری زمین، گھر اور شہیدوں کے ساتھ ساتھ پیچھے چھوٹ چکی تھی...

مجھے نہیں پتہ کہاں سے تمہارے ابو وہ نقدی لے کر آئے.. انہوں نے وہ سونے کا ایک ٹکڑا بیچا تو تھا، جو وہ تمہاری امی کے لئے ان دنوں خرید کر لائے تھے جب ان کے لئے ان کی خوشی سے عزیز تر کچھ نہیں تھا، اور جب وہ ایسا کچھ کرنا چاہتے جن پر تمہاری امی کو فخر ہو کہ وہ ان کی بیوی ہے... لیکن سونے کے اس ٹکڑے کے بدلے جو کچھ ملا وہ ہمارے سارے مسائل کے حل کے لئے ناکافی تھا... یقیناً کوئی اور ذریعہ ہو گا: تو کیا انہوں کچھ قرض لیا ہے؟ کیا انہوں نے کوئی ایسی چیز بیچ دی ہے جو وہ ہم سے چھپا کر اپنے ساتھ لائے تھے؟ مجھے نہیں معلوم، بس مجھے یاد ہے کہ ہم لوگ صیدا کے مضافات کے ایک گاوں میں شفٹ ہو گئے... اور وہاں تمہارے ابو اونچے سنگی بالکنی میں بیٹھ کر پہلی بار مسکرائے تھے... انہیں ۱۵ مئی کا انتظار تھا جب وہ فتحیاب لشکر کی جلو میں وطن واپس لوٹ سکیں گے...

سخت انتظار کے بعد ۱۵ مئی آیا... ٹھیک ۱۲ بجے شب جب میں نیند میں ڈوبا تھا تمہارے ابو نے پاوں سے ٹھوکر مارتے ہوئے پر جوش امید سے گرجتی آواز میں کہا:

— 'اٹھو، دیکھو عرب افواج فلسطین میں داخل ہو رہی ہیں...'

میں مخبوط الحواس اٹھ کھڑا ہوا... رات کے آدھے پہر ہم لوگ ننگے پاؤں ٹیلوں کے پار اس سڑک تک گئے جو گاؤں سے پورے ایک کیلو میٹر پر تھا... ہم سبھی، بچے، بڑے پاگلوں کی طرح ہانپتے کانپتے دوڑے چلے جا رہے تھے... دور

سے راس الناقورا کی طرف چڑھتی گاڑیوں کی روشنیاں نظر آنے لگی تھیں.. جب ہم سڑک پر پہونچے ہمیں سردی کا احساس ہوا.. لیکن تمہارے ابو کی چیخ وپکار میں سارے احساسات دب گئے تھے... وہ بچے کی طرح گاڑیوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے... فوج کے نام سے نعرے لگاتے... پھنسی پھنسی آواز میں انہیں پکارتے.. ہانپنے لگ جاتے... لیکن مسلسل گاڑیوں کی لائن کے پیچھے بچے کی طرح دوڑتے رہے.. ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چیختے چلاتے بھاگتے رہے... نیک دل فوجی اپنی خود کے نیچے سے چپ چاپ بے حس و حرکت ہمیں دیکھتے رہے... ہم ہانپ رہے تھے... جبکہ تمہارے ابو پچاس سال عمر ہونے کے باوجود دوڑتے ہوئے جیب سے تمباکو کے پیکٹ نکالتے جاتے اور انہیں فوجیوں کی طرف اچھال دیتے... مسلسل نعرے ان کی زبان سے نکلتے رہے.... ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ ہی بکری کی ریوڑ کی طرح دوڑے جارہے تھے...

اچانک گاڑیوں کا سلسلہ بند ہو گیا... اور ہم نڈھال اکھڑی سانسیں لیتے گھر کی طرف لوٹ گئے... تمہارے ابو کو چپ لگ گئی... ہمارے پاس بھی بولنے کی سکت نہیں بچی تھی... گذرتی ایک گاڑی کی روشنی تمہارے ابو کے چہرے پر پڑی تو ہم نے دیکھا کہ آنسوؤں سے ان کا چہرا بھیگا ہوا تھا..

اس کے بعد تو جیسے زندگی کی رفتار سست پڑ گئی... پہلے ہم نے خبروں سے فریب کھایا، پھر حقیقت اپنی تمام تلخ کامیوں کے ساتھ ہمیں دھوکہ دے گئی... افسردگی ہمارے چہروں پر عود آئی تھی... گھر ہو یا کھیت، فلسطین اور خوشگوار

ماضی کے بارے میں تمہارے ابو اب بڑی مشکل سے ہی بات کرتے... ہم لوگ ہی اب ان کی نئی زندگی کے المیہ کی اداس داستانیں تھے... اور ہم ہی وہ بدنصیب تھے جو آسانی سے جان جاتے کہ تمہارے ابو کا صبح صبح ہمیں پہاڑوں کی طرف نکل جانے کا حکم دینا، اس کے پیچھے سوائے اس کے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ ہم ناشتہ نہ مانگیں...

حالات اور پیچیدہ ہوتے چلے گئے.. معمولی معمولی باتوں پر تمہارے ابو بھڑک اٹھتے... مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دن کسی نے ان سے کسی چیز کا، جو مجھے یاد نہیں، مطالبہ کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئے... اور ایسے کانپنے لگے جیسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو... ان کی چمکتی آنکھیں ہمارے چہروں پر گھومنے لگیں... کوئی فاسد خیال ان کے ذہن میں آچکا تھا، تو اچانک سے پھڑک کر اٹھ کھڑے ہوئے جیسے وہ کسی تسلی بخش نتیجے تک پہونچ گئے ہوں.. اِس احساس کے طغیانی سے مغلوب کہ ان کے پاس اپنی تمام پریشانیوں کا حل ہے... اور اُس خوف کے زیر اثر جو انسان کسی خطرناک اقدام سے پہلے محسوس کرتا ہے، وہ بہکی بہکی باتیں کرتے ہوئے ادھر ادھر چکرانے لگے، جیسے وہ کچھ ایسا ڈھونڈھ رہے ہوں جو ہم نہیں دیکھ سکتے.. پھر ایک صندوق پر جھپٹ پڑے جو عکا سے ہمارے ساتھ آیا تھا.. اور اس کے سارے سامان کو دیوانہ وار الٹ پلٹ کر رکھ دیا... ایک پل میں تمہاری امی کو سچویشن کا اندازہ ہو گیا، پھر تو اضطرابی ہیجان میں جو ماؤں کو اپنے

بچوں کو کسی خطرے میں دیکھ کر لاحق ہوتی ہے، وہ ہمیں کمرے سے باہر دھکیلتی ہوئی چلانے لگیں: 'بھاگ جاؤ یہاں سے... پہاڑوں کی طرف بھاگ جاؤ...'

لیکن ہم وہیں کھڑکی کے پٹ سے کان لگائے ڈر سے کپکپاتے کھڑے رہے... ہمارے کان میں تمہارے ابو کی آواز آئی: 'میں ان سب کو مار ڈالنا چاہتا ہوں... میں خود کو مار ڈالنا چاہتا ہوں... میں ختم ہو جانا چاہتا ہوں... میں چاہتا ہوں....'

آواز آنی بند ہو گئی... جب ہم نے دروازے کے جھروں سے کمرے میں جھانکا انہیں زمین پر پڑا پایا، ان کے ہانپنے کی آواز آرہی تھی... روتے ہوئے ان کے دانت کڑکڑا رہے تھے... جبکہ امی ایک کونے میں دبکی تشویش سے انہیں تک رہی تھی...

ہمیں کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آیا.... لیکن یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے سیاہ ریوالور ان کے بغل میں پڑا ہوا دیکھا میں سب کچھ سمجھ گیا... اور وحشتناک گھبراہٹ میں جو اچانک کسی بھوت کو دیکھ کر بچے پر طاری ہوتی ہے میں پہاڑوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوا... گھر سے دور...

جیسے جیسے میں گھر سے دور ہو رہا تھا... میرا بچپن پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا.. مجھے احساس ہو رہا تھا کہ زندگی اب ہمارے لئے آسان اور خوشگوار نہیں رہی کہ جسے سکون سے جیا جا سکے... حالات اس قدر کرب انگیز ہو چکے ہیں کہ اب اس کا کوئی حل نہیں رہ گیا سوائے اس کہ ہم میں سے ہر ایک کے سر میں ایک ایک گولی اتار

دی جائے... اس لئے ضروری ہے کہ ہمارا ہر سلوک، ہر عمل ہمارے مناسب حال ہو... بھوک لگی ہو پھر بھی ہم کھانا نہیں مانگیں گے... تمہارے ابو جب اپنے مسائل گنا رہے ہوں تو ہم خاموشی سے سنیں گے... اور جب ہمیں پہاڑوں پر جانے اور شام تک واپس نہ آنے کو کہیں گے تو مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلائیں گے...

شام کو... جب تاریکی ہر طرف پھیل چکی تھی میں واپس لوٹا... تمہارے ابو کی طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی... تمہاری ماں ان کے پہلو میں بیٹھی تھی... تم سب کی آنکھیں بلی کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں.. تمہارے ہونٹ اوپر نیچے ایسے چپکے تھے جیسے کبھی کھلے ہی نہ ہوں... جیسے وہ ہونٹ نہیں کسی ایسے زخم کے نشان ہوں جو مکمل نہیں بھرے..

تم سبھی وہاں ایک ڈھیر کی طرح جمع تھے... اپنے بچپن سے دور... ایسے ہی جیسے تم سنتروں کی زمین سے دور تھے... سنترے جن کے بارے میں ایک کسان نے جو پہلے سنتروں کی کھیتی کرتا تھا پھر چھوڑ کر چلا آیا، ہمیں بتایا کہ اگر سنتروں کی آبیاری کرنے والا مالی بدل جائے تو سنترے سوکھ جاتے ہیں...

تمہارے ابو اب تک بیمار اور صاحبِ فراش تھے... اور تمہاری امی کی آنکھوں سے میں اسی المیے کی پرچھائی تھی جو آج بھی اُن آنکھوں میں بستی ہے...

میں کسی اچھوت کی طرح چپکے سے کمرے میں داخل ہوا.. میری نظر تمہارے والد کے چہرے پر پڑی جو کسی لاچار کے غصے کی طرح غصے سے تمتمارہا تھا.. اسی وقت میری نگاہ سیاہ ریوالور پر بھی پڑی جو ایک چھوٹی میز پر پڑا تھا، اس کے بغل میں ایک سنترہ رکھا تھا...

سنترہ سوکھ کر پژمردہ ہو چکا تھا...

کویت-۱۹۵۸

* * * * * * * * * * * * * *

ممنوعہ ہتھیار

عربی عنوان: السلاح المحرم

۱

یہ قصہ کچھ ایسے شروع ہوا:

ابو علی گھر لوٹ رہا تھا، اچانک طبیعت ناساز ہونے کی جہ سے آج غروب سے پہلے ہی اس نے اپنی دوکان بند کر دی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ گھر جا کر مین گیٹ کے سامنے چھوٹی کرسی پر تھوڑی دیر آرام کرے گا، پھر کھانا کھا کر سو جائے گا.. پتہ نہیں کیوں اس کی طبیعت اچانک بگڑ گئی... شاید ام علی نے صبح جو کھانا پیتل کے ایک بڑے ڈبے میں دیا تھا خراب ہو گیا تھا.. تھا بھی تو باسی، کل کا پکا ہوا.. یا شاید پل پل بدلتا موسم اس کی وجہ ہو.. بہر حال ابو علی نے بہتر سمجھا کہ دوکان بند کر دے... اگر خدانخواستہ اس کے ساتھ کوئی ناگہانی ہی ہونی ہے تو بہتر

ہے کہ ایسے وقت وہ اپنوں کے درمیان ہو.. ام علی کے سامنے... اس کی بانہوں میں ہو..

اسی وجہ سے وہ اس وقت بعینہ گاؤں کے میدان سے گذر رہا تھا۔ اگر اس کی طبیعت ناساز نہیں ہوئی ہوتی تو اس وقت وہ وہاں نہیں ہوتا.. اور پھر یہ سارا قصہ پیش نہیں آیا ہوتا...

اس سے کچھ قدم دور پکے میدان کے دوسری طرف، گاؤں کے نوجوان اور کچھ بزرگ کسی چیز کے گرد دائرے کی شکل میں ایک دوسرے میں گتھے ہوئے جمع تھے۔ ابو علی نے اپنی جگہ سے ہی واقعہ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوا۔ اگر کوئی معمولی بات ہوتی تو عبد اللہ، فاروق کے بغل میں کھڑا نہیں ہوتا.. دونوں ایک دوسرے کے ازلی دشمن تھے۔ معاملہ گمبھیر لگتا ہے.. یہاں بھی اگر وہ اپنی تجسس سے مغلوب نہیں ہوتا، تو قصہ پیش ہی نہیں آتا، مگر طبیعت ناساز ہونے کے باوجود اس نے راستہ بدل دیا، اور حقیقت حال جاننے کے لئے لوگوں کے دائرے کی طرف چل پڑا۔ دائرے تک پہونچنے سے پہلے ہی لوگوں کے ہٹتے سٹتے کندھوں کے درمیان سے اس نے دیکھ لیا کہ ایک جیپ لگی ہے، جس کے پاس ایک اجنبی فوجی پورے یونیفارم میں کھڑا ہے، اس کے کندھے سے نئی بندوق لٹک رہی تھی۔

اسے یاد آیا کہ وہ فوجی اس سے پہلے بھی کئی بار اس گاؤں میں سکونت کے ارادے سے آیا تھا، لیکن ہر بار گاؤں والے انکار کر دیتے، صرف اس لئے کہ اس

کے پاس ہتھیار تھا، اور گاؤں والوں کی رائے تھی کہ انسان کے ہاتھ میں ہتھیار ہونا، مطلب قتل کا لائسنس دینا... کوئی اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ فوجی کسی دن اگر اس پر احساس برتری اور طاقت کا نشہ چڑھا تو وہ لوگوں پر گولیاں نہیں چلادے گا؟ گولیاں لوگوں پر نہیں، لگڑ بگھوں پر چلنی چاہیے.. یہی سوچتے سوچتے وہ دائرے تک پہونچا، اور منظر دیکھتے ہی سب کچھ اس کے سمجھ میں آگیا۔ اس کے باوجود دائرے میں اپنی شمولیت کو واجب ٹھہرانے کے لئے اس نے اپنے بغل میں کھڑے شخص سے پوچھا:

— 'کیا چل رہا ہے یہاں؟'

— 'افسر فوجی کو یہاں کھڑا کر کے 'پردھان' کے گھر گیا ہے، اس شخص نے جواب دیا'۔

— 'مطلب اس بار وہ افسر کو ساتھ لایا ہے'۔

— 'ہاں، اور وہ پردھان سے گفت وشنید کرنے گیا ہے... شاید اس بار وہ مان جائے..'

— 'اور تم لوگ؟'

— 'یہ لوگ اس کی بندوق اچکنا چاہتے ہیں'۔

اس نے دائرے میں گھسنے کی کوشش کی تو لوگوں کے بیچ اسے پاؤں رکھنے کی جگہ مل گئی، مگر وہ کندھے اور ہاتھ سے بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتا گیا ،یہاں تک کہ اگلی لائن میں پہونچ گیا۔ وہ فوجی ٹھیک اس کے سامنے تین یا چار

میٹر کی دوری پر کھڑا تھا... اپنی جگہ سے وہ اس کی بندوق کی خصوصیات کا اندازہ کر سکتا تھا: بندوق نئے ماڈل کی تھی، اس کے میگزین میں ۸ گولیاں لگ سکتی تھیں.. میگزین بالکل نیا تھا، اس میں کوئی داغ یا زنگ کا دھبہ نہیں تھا، اس نے دل میں سوچا بندوق کی قیمت ۱۰۰ پونڈ سے زیادہ ہی ہو گی۔

— 'کون اسے اچکنا چاہتا ہے'، اس نے بغل والے سے پوچھا۔

— 'ابھی کسے نے طے نہیں کیا۔ ذرا اس کی نیلی آنکھیں دیکھو کیسے گردش میں ہیں، کمبخت، شکاری کتے کی طرح چوکنا ہے'۔

ابو علی نے تھوڑا غور کیا، پھر اچانک فیصلہ کر لیا۔ وہ سودا اس کے سر میں سما گیا تھا... اپنی علالت بھی اسے یاد نہیں رہی۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ فوجی وہاں نہیں رہ سکتا، لیکن اس کی بندوق اگر چھین لی جائے تو پھر کوئی حرج نہیں، پھر وہ بھی سب کی طرح ہو گا اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہونچا سکے گا... اس لئے اس سے اس کی بندوق چھیننا ضروری ہے، بس اس کا فیصلہ آخری ہے...

لیکن بات اتنی آسان نہیں تھی۔ سچ ہے کہ بندوق کی نالی پر لمبا چاقو نہیں لگا تھا، لیکن وہ چاقو فوجی کے بیلٹ سے لگا لٹک رہا تھا، اور ضرورت پڑنے پر اسے نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ علاوہ ازیں افسر بھی کسی لمحے واپس آ سکتا تھا... یہ کوئی کھیل نہیں تھا... پھر آدمی کو کوئی بھی اقدام کرنے سے پہلے اس کے فوائد و نقصانات پر ہر زاویے سے غور کر نا لینا چاہئے۔ لیکن قبل اس کے وہ کچھ غور و فکر

کرتا اس نے لوگوں کی رائے لینے کا ارادہ کر لیا اور بلند آواز سے تاکہ سبھی سن لیں پکار کر پوچھا:

— جوانو! کون تم میں آگے بڑھے گا...؟'

کسی نے جواب نہیں دیا، بس یہ ہوا کہ سب کی آنکھیں اس کی سمت مڑ گئیں۔ دائرہ کے بیچ کھڑے فوجی کی نیلی آنکھیں بھی... وہ سہما ہوا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی ادنی حماقت بھی لوگوں کی بھیڑ کے ہاتھوں، جس نے اسے دیوار کی طرح گھیر رکھا ہے، فوری موت کے گڑھے میں دھکیل دے گی۔

ابو علی نے دوبارا پکارا:

— 'جوانو! سنو میں ہی اسے چھینوں گا'۔

— 'وہ آپ ہی کی ملکیت ہے، ابو علی'، سامنے دائرے سے آواز آئی۔

— 'میں ہی اسے اس سے چھینوں گا'، ابو علی نے اور زور سے کہا، گویا وہ خود کے اندر جوش پیدا کر رہا ہو۔

— 'وہ آپ کے لئے حلال ہے، ابو علی! وہی آواز آئی۔

— 'ہاں ہاں وہ میرے لئے حلال ہے، اور میں اسے لے کر رہوں گا'، اس نے بھی دہرایا۔

کچھ پل اس نے سوچا، پھر اپنے آس پاس نظر گھماتے ہوئے آہستہ سے کہا:

— 'جب بندوق میرے ہاتھ میں آجائے، تو راستہ چھوڑ دینا، تاکہ میں بھاگ نکلوں، اور اگر فوجی میرا پیچھا کرنے کی کوشش کرے تو اس کا راستہ بند کر دینا'۔

— 'ہم سمجھ گئے ابو علی، ہم پر بھروسہ رکھو'۔

— 'مجھے بھروسہ ہے تم لوگوں پر..'

ابو علی نے پھر اپنے دل میں کہا: 'اب اقدام کا وقت آگیا'۔ ڈر کا ایک لمحہ برق کر طرح گذر گیا۔ جھک کر اس نے اپنے جوتے اتارے اور کچھ کہے بغیر اپنے بغل میں کھڑے ایک شخص کے حوالے کر دیا.. کام کا وقت شروع ہو چکا ہے، جوتے بھاگتے ہوئے دقت ہی پیدا کریں گے... سر سے اس نے رومال اور عقال بھی اتار لئے، عقال کو گردن میں ڈالا اور رومال کو کمر میں باندھ لیا... جھک کر عبا کا ایک گوشہ اٹھایا اور اسے بیلٹ میں اڑس لیا، اس سے اس کے دونوں پاؤں کے بیچ زیادہ جگہ بن گئی جو دوڑنے کے لئے ضروری تھی۔ سفید لمبا پائجاما جو ٹخنوں سے اوپر تنگ تھا اس سے اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

تین یا چار میٹر کی دوری پر بندوق لٹکائے کھڑا وہ فوجی سب کچھ سمجھ رہا تھا، مگر وہ اپنی جگہ کھڑا دیکھتا رہا.. کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ ابو علی جانتا تھا کہ وہ اپنا ہتھیار نہیں استعمال کرے گا، جو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خالی ہو... وہ وہاں نا قابل رشک پوزیشن میں کھڑا تھا.. اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کرنا کیا چاہئے، بس اس کی نگاہ ابو علی پر مرکوز تھی، جو اپنی تیاریوں میں مشغول تھا۔ جیسے ہی ابو

علی نے اپنے جلباب کا ایک کنارہ پکڑ کر اوپر سمیٹا، فوجی نے کندھے سے اپنی بندوق اتار لی اور اپنے سامنے زمین پر اس کے دستے کو ٹکا دیا، پھر اس کے کھردرے چرمی بیلٹ کو مضبوطی سے اپنے پیروں میں دو تہہ لپیٹ لیا، اپنے بھاری جوتوں کی ہیل ایک دوسرے سے ٹھک سے بجا کر چوکس کھڑا ہوا اور پھر سے ابو علی پر نظر گاڑ دی۔

ابو علی نے بغل والے آدمی سے، جس نے جوتوں کو بغل میں دبا لیا تھا اور دونوں ہاتھ کی انگلیاں پشت پر ایک دوسرے سے پھنسا رکھا تھا، کہا:

— 'بدبخت نے سارا پلان چوپٹ کر دیا، دیکھو کیا کیا اس نے! کمبخت چاہتا ہے کہ بندوق کے ساتھ ساتھ میں اس کو بھی اچک لوں!'

— 'بندوق اس کی پنڈلیوں سے کھول لو'، بغل والے آدمی نے اطمینان سے کہا۔

— 'کیسے؟'

— 'اسے زمین پر پچھاڑ کر...'

اب بو علی اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔ آدھا راستہ وہ تقریباً طے کر چکا تھا۔ بڑے شرم کی بات ہوتی اگر اب وہ اپنا جلباب پھیلاتا، اپنے جوتے واپس لیتا.. فوجی ابھی بھی اسے گھور رہا تھا، اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے.. اور ہیٹ جلتے سر پر چمک رہا تھا...

ابو علی نے دونوں بازو جہاں تک ممکن تھا پھیلا دئے، اور دونوں طرف کھڑے لوگوں کو ایک قدم پیچھے دھکیل دیا، پھر مضبوط قدموں سے حلقہ کے وسط کی طرف بڑھا... فوجی سمجھ گیا کہ اب جنگ شروع ہونے والی ہے، تو بندوق کو کس کر پکڑ کے اپنے سینے سے چمٹا لیا... اس کی نگاہ پل کے لئے بھی ابو علی سے نہیں ہٹی تھی، جواب ٹھیک اس کے سامنے بس ایک قدم کی دوری پر پہونچ گیا تھا... ابو علی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں.. اسے لگا کہ جیسے پیچھے سے کوئی ہلکی تھرکتی آواز اٹھ رہی ہو: 'ابو علی، لوگوں کے سردار!'

اس نے اپنے سخت اور سیدھے بازو کھول دیئے، اور ہتھیلی سے بندوق کی نالی کو فوجی کے ہتھیلی کے اوپر کس کر پکڑ لیا.. پھر فوجی کی طاقت کا اندازا لگانے کے لئے دو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے، اور جب اس کی مضبوط گرفت کو محسوس کیا تو زور سے نالی کو اپنی طرف کھینچا، لیکن فوجی نے پوری طاقت لگا دی اور بندوق کو اور زیادہ اپنے سینے کی طرف بھینچ لیا... اس کا جسم اکڑتا جا رہا تھا اور چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا... جب ابو علی نے پوری طاقت سے جھٹکا دیا، فوجی کا جو تا میدان کے پکے فرش پر پھسلا اور وہ پیٹھ کے بل گر گیا.. برق رفتاری سے ابو علی نے بندوق کو دوبار گھمایا، تو اس کا بیلٹ ہوا میں لٹکے فوجی کے پیر سے الگ ہو گیا۔ ابو علی نے اپنی بڑی بڑی کھردری ہتھیلیوں سے بندوق کو اٹھایا، سرمستی سے اسے نہارتے ہوئے اپنے سامنے پھیلایا اور زور سے آواز لگائی:

— جوانو! راستہ چھوڑو!

تنگ دریچے سے جو اسی جگہ کھلا تھا جہاں پہلے وہ کھڑا تھا، ابو علی پھرتی سے باہر نکلا۔ دریچہ پھر لوگوں کے کندھوں سے اٹ گیا... جبکہ ابو علی کیچڑ سے بھری گلیوں کو پھلانگتے گھر کی طرف بھاگا جارہا تھا۔

۴

لیکن... ابو علی گھر نہیں پہونچا۔

ابو علی کہیں کھو گیا، اور اس کے ساتھ بندوق بھی کھو گئی۔ اگر ابو علی کوئی عام آدمی ہوتا اور یہ واقعہ کوئی عام واقعہ ہوتا کسی کو کوئی پرواہ نہیں ہوتی، لیکن اہم بات یہ تھی کہ ابو علی کوئی عام شخص نہیں تھا، کیونکہ اس کا گھر بھرا پورا تھا، اس کی بیوی تھے.. بچے تھے.. اور وہ پوری فیملی کا سچا نگہبان تھا۔ یہی نہیں، بلکہ ابو علی کا گھر گاؤں کا سب سے پہلا گھر تھا، جو مغربی کنارے ایک ٹیلے پر واقع تھا، جہاں زیتون کے پیڑ لہلہاتے تھے.. شروع سے ہی وہاں کے لوگوں نے اس گھر کو وہیں دیکھا تھا... خود ابو علی کے پیدا ہونے، بلکہ اس کے دادا کے بھی پیدا ہونے کے پہلے سے وہ گھر وہیں موجود تھا... بغیر کسی نزاع کے باقاعدہ وہ گھر نسل در نسل وراثت میں منتقل ہوتا آرہا تھا.. گھر کے ساتھ وارثین تک وہ ذمہ داریاں بھی منتقل ہوتی رہی تھیں جو لوگوں کی تا حد واقفیت ہمیشہ سے اسی گھر سے وابستہ تھیں۔

ابو علی کا گھر گاؤں کا صدر دروازہ اور مغربی سرحد تھا.. زیتون کے پیڑوں سے آباد اس ٹیلے کے نیچے تا حد نگاہ پھیلی جھاڑیوں میں لکڑ بگھوں کی بہتات تھی جو کڑاکے کی سردی پڑنے پر کھانے یا شاید گرمی کی تلاش میں گاؤں پر دھاوا بول دیتے... ابو علی کے خاندان نے کسی کے کہے بغیر سردیوں میں لکڑ بگھوں کو روکنے کی ذمہ داری کو سنبھال رکھا تھا، اس لئے کہ ان کا گھر گاؤں اور جھاڑیوں کی بیچ حد فاصل تھا۔ گاؤں والوں نے بھی اس حق کو تسلیم کر لیا تھا، کیونکہ جب سے وہ دیکھ رہے تھے یہ ذّمہ داری اسی خاندان سے وابستہ تھی..

آگے پھر سے بندوق کا قصہ شروع آتا ہے:

لوگ اس اتفاقیہ واقعے سے خوش تھے کہ اب ابو علی کے پاس ایک نئی بندوق تھی، وقت آچکا تھا کہ ابو علی کے پاس اس کلہاڑی کی جگہ جسے وہ ہر سردی کے موسم میں لکڑ بگھوں سے لڑنے کے لئے استعمال کرتا تھا، ایک نئی بندوق ہو۔ سردی کا موسم شروع ہوا چاہتا ہے، ابو علی کے پاس اس بندوق کا ہونا ضروری تھا۔

لیکن حالات نے وہ رخ نہیں لیا جو وہ چاہتے تھے، یا جو ابو علی چاہتا تھا۔ واقعے کے دو دن بعد ہی لکڑ بگھے گھر تک پہونچ گئے اور رات بھر اس کے چاروں طرف گھومتے رہے، اور پلک جھپکتے ہی سب کچھ بدل گیا۔

ام علی کو اپنے بچوں کا اندیشہ تھا اس لئے انہیں گاوں میں بھیج دیا تا کہ وہ اس خوف سے محفوظ رہیں اور وہ اکیلی ہی گھر میں اپنے شوہر اور اس کے انجام پر

روتی بلکتی رہی.. لکڑ بگھوں کی تعداد رات بہ رات بڑھتی ہی جارہی تھی... گھر کے چاروں طرف رات بھر وہ چکر لگاتے رہتے اور چیخ چیخ کر گاؤں کے سکون کا سینہ چاک کرتے جس سے پورے گاوں میں دہشت پھیل جاتی..

ابو علی کا چیستاں بھی کم مشقت طلب نہیں تھا... بند مجلسوں اور مختار کے گھر میں صرف ابو علی کی ہی باتیں ہوتیں: کہاں چلا گیا؟ کیا ہوا؟ کیا کسی اور گاؤں تو نہیں چلا گیا جہاں اس نے بندوق بیچ دی اور کسی اور عورت سے شادی کرلی؟ یا مارا گیا اور کان وکان خبر ہونے سے پہلے ہی اس کو دفن کر دیا گیا؟

ایسی اٹکلیں شہر کی فضا میں عرصے تک بلا توقف مستقل گردش کرتی رہیں، حتی کہ وقت کی گرادب میں سارے شبہات واٹکلیں دم توڑ گئیں، اب کسی کو بھی اس گھر اور ابو علی کی اس فیملی کی کوئی فکر نہیں رہی جو شہر کی گلیوں میں بکھر گئی تھی.. ایک دن جب علی، مختار سے کوئی مشورہ لینے اس کے گھر گیا، ڈرائنگ روم ان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا جو ابو علی کے قصے کے ہر نقطے پر زور دار گرما گرم بحث ومباحثہ کر رہے تھے.. بے سود علی نے مختار تک پہونچنے کی کوشش کی لیکن وہ جیسے ہی قدم بڑھاتا لوگ اس کا راستہ روک لیتے... انجام کار اس کے پاس واپس ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا..

۳

ابو علی نے بندوق کو اپنے سینے سے چمٹایا اور کیچڑ سے بھری گلیوں کو پھلانگتا گھر کی طرف بھاگنے لگا، پسینے سے اس کی پیٹھ اور سینہ بھیگ چکے تھے... جب ہوا کا

کوئی جھونکا اس کے کپڑے اور بدن سے گذرتا اسے محسوس ہوتا جیسے اس پر سردی کوڑے برسا رہی ہو، مگر اس سے اس کے حوصلے پر کوئی اثر نہیں پڑا... اسے جلد گھر پہونچنا تھا... بندوق بھاری تھی... جب بھی وہ کسی موڑ سے مڑتا یا کوئی پل پار کرتا بندوق کا وزن اپنے بازوؤں پر بڑھتا ہوا محسوس کرتا... جب اس کا سینہ کھنکورتی کرب انگیز کھانسیوں سے دھونکنے لگا اسے یاد آیا کہ وہ بیمار ہے اور آج اس نے دوکان جلدی اس لئے بند کردی تھی وہ گھر جاکر آرام کرنا چاہتا تھا... مگر جب اسے اپنے ہاتھوں میں تھامے اس دولت - آٹھ گولیوں والے میگزین کی بندوق - کا خیال آیا، اطمینان کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اسے وہ خاموش ٹھٹھرتی راتیں یاد آئیں جب وہ کھڑکی کے پیچھے بیٹھا بلی کی طرح تاریکی میں ٹکٹکی باندھے بیٹھا رہتا۔ جیسے ہی اسے کسی لکڑ بگھے کا ہیولا نظر آتا، یا اس کی نفرت انگیز بدبو اس کی ناک سے ٹکراتی، وہ دبے پاؤں، پیٹھ جھکائے، پچھلے دروازے سے اس کی طرف لپکتا، اس کی گرفت کلہاڑی کے دستے پر مضبوطی سے جمی ہوتی.. لکڑ بگھا اس چھوٹے بغیچے میں گھر جاتا جس میں صرف مرغیوں کے لئے ایک چھوٹی کھوپری تھی، اور پھر مقابلہ شروع ہو جاتا، گھڑی، دو گھڑی بعد ام علی نکل کر آتی اور اس کریہہ شکل جانور کی لاش اٹھا کر ٹیلے سے جنگل میں پھینک دیتی... اب نہیں، اب اس کی ضرورت نہیں ہوگی.. اب جیسے ہی ڈراؤنا سایہ نظر آئے گا وہ کھڑکی سے ہی گولی چلادے گا، اب ہمیں خالی باغ میں اس وقت بھی جانے سے کوئی ڈر نہیں ہوگا، جب لکڑ بگھے بڑی تعداد میں جمع ہوتے

ہیں.. جیسا گذشتہ سردی میں ہوا تھا.. نہیں! اب اس کے پاس بندوق ہے جس میں ۸ گولیاں لگتی ہیں.. اس نے بندوق کو سینے سے اور زیادہ چمٹالیا۔ اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ پوری رفتار سے جتنا اس کی پنڈلیوں میں سکت تھی بھاگا جارہا تھا... مسلسل ہانپنے اور کھانسنے کے باوجود وہ فوجی کے بھاری بوٹوں کی آواز اپنے پیچھے نزدیک سے ہی آتے سن رہا تھا... بوٹوں کی بھاری بازگشت اس کے سر کے اوپر ایک دوسرے سے لگی مٹی کی دیواروں کے درمیان گونج رہی تھی... اچانک دو سائے اس کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے، وہ رک گیا، اس کا سینہ مسلسل دھونکنی کی طرح پھول اور پچک رہا تھا...

— 'بندوق ہمیں دے دو!'

ان میں سے ایک نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے ہتھیلی کھولے اپنا ہاتھ بڑھایا، جیسے اسے پورا یقین ہو کہ ابو علی بندوق اس کے ہاتھوں پر رکھ دے گا... لیکن ابو علی نے بندوق ایک طرف کرلیا اور دوسری طرف سے اس کے پھیلے ہاتھ کو بندوق تک پہونچنے سے روک دیا... ہانپنے کی وجہ سے اس کے منہ سے کچھ نہیں نکلا، اس شخص نے دوبارہ اسی لہجے میں کہا:

— 'بندوق مجھے دو.. کیا تم نے سنا نہیں؟'

ابو علی نے تھوک نگلتے ہوئے کمزور آواز میں کہا:

— 'یہ میری ہے... میری جائز ملکیت...'

— 'ہم نے تمہیں چراتے ہوئے دیکھا ہے... لاؤ ہمیں دو..'

— 'یہ میری ملکیت ہے'۔

— 'دیتے ہو کہ نہیں...!'

ابو علی ایک قدم پیچھے ہٹا، فوجی کے بوٹ کی آواز قریب آگئی تھی، جس سے پوری گلی کا سکون درہم برہم ہو گیا تھا...

فوجی کے بوٹوں کی آواز کے ساتھ کچھ اور آوازیں بھی وہ سن رہا تھا، شاید افسر فوجی کے ساتھ تھا، بلکہ ہو سکتا ہے مختار بھی ان لوگون کے ساتھ ہو گیا ہو.. اللہ کی پھٹکار... لگتا ہے پورا گاؤں ہی اس کے تعاقب میں لگ گیا ہے...

جلدی سے وہ پیچھے مڑا، پھر سایے میں کھڑے دونوں کو گھورنے لگا..

— 'میں نے پہچان لیا ہے تم دونوں کو... راستہ چھوڑو، وہ لوگ میرے پیچھے آرہے ہیں'۔

ان میں سے ایک آگے بڑھا اور اس کی گردن پکڑ لی، جب کہ ابو علی نے جہاں تک اس کا ہاتھ پھیل سکتا تھا بندوق اپنے پیچھے سے اس سے دور کر لیا... اسے لگا جیسے اب اس کی سانس رکنے والی ہو۔

— 'بندوق ادھر لاؤ، ورنہ ہم تمہارا گلا گھونٹ دیں گے..'

— 'تم دونوں کو میں نے پہچان لیا ہے...'

اسے حیرت تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے شدید نفرت کے باوجود مل کیسے گئے؟

— 'میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، چھوڑو مجھے، حلق میں بچی سانس جمع کر کے وہ چیخا'۔

— 'ہمیں بندوق دے دو، ورنہ ہم تمہیں مار ڈالیں گے...'

ابو علی نے پیچھے گردن گھمائی، اسے لگا جیسے گلی کے سرے پر بہت سے لوگ اس کی طرف بڑھ رہے ہیں، تو اس نے گردن چھڑانے کی ایک بھرپور کوشش کی، لیکن ایک انگشت بھر بھی وہ ہل نہیں پایا، مگر اسے یہ پورا یقین تھا کہ دنیا کے سارے ابلیس مل کر بھی اس کی ہتھیلوں کی گرفت سے بندوق نہیں نکال سکتے، الا یہ کہ اس کا ہاتھ ہی اس کے کندھے سے بندوق کے ساتھ اکھڑ جائے، اس لئے اپنی آواز میں اپنی پوری طاقت سمیٹ کر اس نے کہا:

— 'مجھے چھوڑ دو... ورنہ ہم سب مارے جائیں گے!'

— 'بندوق ہمیں دو'۔

— 'ناممکن'۔

دونوں نے اپنے پیچھے دیکھا، پھر ایک نے دوسرے سے پوچھا:

— 'اب کیا کریں؟'

دوسرے نے بسرعت جواب دیا:

— 'یہیں ٹھہر کر انہیں روکنے کی کوشش کرو، انہیں باتوں میں الجھاؤ'۔

ایک نے اسے چھوڑ دیا، جب کہ دوسرا اس کی گردن اور بازو کو پیچھے سے پکڑ کر آگے کی طرف درشتگی سے دھکیلنے لگا... وہ ناچار گردن اور بازو پر اس کی کرخت گرفت سے مجبور ہو کر دوڑنے لگا۔

ابو علی کی ہمت جواب دے چکی تھی، خوف نے اس کی حالت اور دگرگوں کر دی تھی، اس کی گردن اور بازو سختی سے جکڑے ہوئے تھے، اس سب کے باوجود اچانک اسے یہ احساس ہو گیا کہ جس راستے پر وہ بھاگ رہے ہیں وہ اس کے گھر کا راستہ نہیں ہے، اس نے مڑنے کی کوشش کی لیکن اس آدمی کی گرفت بہت سخت تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب اس کے اندر جان نہیں بچی ہے، اس کے پھیپھڑے کی تہہ سے نکلنے والی خون آلود کھانسی اس کے نرخرے کے ساتھ باہر آئے گی اور سڑک پر اگل دے گی... ایک بار پھر اس نے زور لگایا کہ گرفت سے نکل سکے یا کچھ دیر ٹھہر سکے لیکن دونوں ہتھیلیاں اور زیادہ سختی سے اور بے دردی سے بھینچ گئیں.... اس کی آنکھوں میں آنسوں کے قطرے جم گئے اور اسی لمحے اسے ادراک ہو گیا کہ اب کوئی راہ نجات نہیں....

بیروت-۱۹۶۱

٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭٭

کچھ نہیں!

عربی عنوان: لا شيء

میڈیا میں خبر آئی کہ سرحد پر تعینات ایک فوجی اچانک اپنی مشین گن سے مقبوضہ علاقے میں گولیاں برسانے لگا، اس وجہ سے اسے اعصابی امراض کے اسپتال (پاگل خانہ) منتقل کر دیا گیا۔

☆☆☆☆☆

زندگی میں پہلی بار اس نے نروس بریک ڈاؤن یا اعصابی خلل کا لفظ سنا تھا۔ اس نے وارڈ بوائے سے جو اسے باہر لے جا رہا تھا پوچھا:

— 'نروس بریک ڈاون کیا ہوتا ہے؟'

– 'اس کا مطلب ہے کہ تم صحیح دماغی حالت میں نہیں ہو'، وارڈ بوائے نے رکھائی سے جواب دیا.

اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلی سر کے ایک طرف رکھتے ہوئے سوال کیا؟

– 'یہاں؟'

– 'ہاں، یہاں!'

تھوڑی دیر کے لئے وہ چپ ہو گیا،...بات واضح نہیں ہوئی تھی. جب اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے تو دوبارہ سوال داغ دیا:

– 'نروس بریک ڈاون... یہاں؟'

– 'ہاں...'

– 'سمجھ میں نہیں آیا...؟'

– 'یہ سمجھ لو کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے...'

– 'کیسے..؟'

وارڈ بوائے نے اسے بازوؤں سے زور سے کھینچا، تو وہ عالم خیال سے باہر آیا اور اسے احساس ہوا کہ وہ بیکار بکواس کر رہا تھا۔ زبان اس کے کنٹرول سے باہر ہو گئی تھی۔ جیسے کسی بڑی سی کالی مکڑی نے اس کی پیشانی میں اندر سے قبضہ جما لیا تھا اور اس کی دونوں آنکھوں کے بیچ باریک مضبوط جالے بننے لگی تھی..

– 'کہاں لے جا رہے ہو مجھے ابھی؟'

– 'تمہیں چیئرمین صاحب سے ملنا ہے...'

چلتے چلتے اس نے رکنے کی کوشش کی، لیکن وارڈ بوائے نے درشتی سے دھکا دیا تو ناچار چلتا رہا...

— 'اچھا بتاؤ، چیئرمین سے اس ملاقات کے پیچھے بھی اعصاب وعصاب کا کوئی معاملہ ہے کیا؟'

اس نے پھر سے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ مکڑی کا جالا پھیلتا جارہا تھا...

— 'غالباً، ہاں...'

— 'ہاں کیا؟'

— 'اوف!'

ایک بار پھر اسے یہ احساس ستانے لگا کہ جیسے واقعی اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہو... اس کے باوجود وہ زبان کی لگام جہاں تک ممکن ہو ڈھیلا چھوڑ دینا چاہتا تھا:

— 'کیا تمہیں ایک بات پتہ ہے'۔

— 'کیا؟'

اس نے زمین پر اپنے پاؤں ٹکا دیے، اور وارڈ بوائے کے چہرے کے سامنے اپنی انگلی ہلانے لگا، اور جب وارڈ بوائے نے اسے آگے کھینچنے کی کوشش کی، اس نے اپنے پاؤں اکڑا لئے اور ٹس سے مس نہیں ہوا...

— 'میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں...'

— 'کیا؟'

— 'اسے اعصابی خلل کہتے ہیں یہ تو صحیح ہے، لیکن وہ یہاں نہیں ہوتا..'

— 'تو کہاں ہوتا ہے؟'

— 'یہاں'، اس نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجہ میں کہا۔

— 'اعصابی خلل کبھی سینے میں نہیں ہوتا...'

— 'کون کہتا ہے؟'

— 'ڈاکٹر اور کون...!'

— 'پاگل ہیں سب'۔

کچھ دور چلنے کے بعد وہ پھر رک گیا، اور دوبارہ وارڈ بوائے کے چہرے کے سامنے انگلی لہراتے ہوئے بولا:

— 'سارے ڈاکٹر پاگل ہیں... پھر یہ کوئی میڈیکل کیس نہیں ہے، بلکہ ملٹری کیس ہے...'

— 'ایسا کیوں؟'

— 'اس لئے کہ میں خود بھی ایک فوجی ہوں!'

— 'اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'

— 'کیا مطلب ہے تمہارا؟'

وارڈ بوائے پھر سے اسے درشتگی سے سنسان بے داغ راہداری میں کھینچنے لگا... راہداری کے دونوں طرف پھیلے کمروں کے دروازے بند تھے... مکڑی اب اس کی آنکھوں کے درمیان جالے تانتے ہوئے گنگنانے لگی تھی..

— 'کیا وہ کہیں دور رہتے ہیں؟'

— 'کون؟'

— 'چیرمین...'

— 'راہداری کے سرے پر...'

اسے جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ گفتگو کا سلسلہ اتنی جلدی ختم ہو جائے گا۔ اس کی خواہش ہو رہی تھی کہ بس بولتا رہے... خواہش کی بے رحم تیز دھار سے اس کی کنپٹیاں سلگ رہی تھیں... وارڈ بوائے اسے کھینچ کر لے جانے پر بضد تھا.... ٹھہرنے کی اس کی سب کوششیں بے کار جا رہی تھیں..

— 'سنو! تم نے مجھے کھینچ کھینچ کر تھکا دیا ہے... کیوں نہ ذرا دیر کو ٹھہر کر ہم آرام کر لیں... اور پھر جیسا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے میں مریض آدمی ہوں'۔

وارڈ بوائے رک گیا، کچھ پل اس کو دیکھتا رہا، پھر موافقت میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ہونٹ کس کر بند کر لئے، جبکہ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور مکڑی کی سست رفتار حرکتوں کا معاینہ کرنے لگا جو کہ اس کی پیشانی کے اندر اپنا گھونسلہ بنانے میں جٹی تھی...

— 'اسے کیسے پتہ چلا کہ میں اس... اس... اس بیماری میں مبتلا ہوں جس کا تعلق اعصاب سے ہے؟'

— 'اعصابی خلل؟'

— 'ہاں ہاں... اعصابی خلل... کیسے اس کو پتہ چلا؟'

— 'تم سے کچھ خاص نوعیت کے سوالات کر کے... وہ مریض کے جواب سے بیماری کا پتہ لگا لیتے ہیں..'

— 'مگر اس نے تو کچھ زیادہ سوالات نہیں کئے.. اس نے دو یا تین سوالات ہی مجھ سے کئے تھے، پھر جھک کر رجسٹر میں لکھنے لگا تھا... اس نے مجھ سے پوچھا: 'تم نے گولی چلانے سے پہلے کیا محسوس کیا؟' میں نے کہا کچھ بھی نہیں... پھر اس نے پوچھا: 'گولی چلانے کے بعد تم نے کیسا محسوس کیا؟' میں نے کہا: میں نے کچھ بھی نہیں محسوس کیا۔

— 'بس؟'

— 'ارے نہیں! جب میں نے کہا کہ مجھے کچھ بھی نہیں محسوس ہوا، تو اسے شدید مایوسی ہوئی! وہ کچھ تو لکھنا چاہتا تھا۔ تو میں نے سوچا کہ اس کی مدد کر دوں، اس لئے میں نے اس سے کہا...'

— 'کیا کہا تم نے؟'

— 'میں نے کہا کہ گولی چلنے کے بعد مجھے بس ایک چیز کا احساس ہوا.. مجھے احساس ہوا کہ بندوق کا میگزین بہت جلدی ختم ہو گیا'۔

— 'کیاواقعی تمہیں ایسالگا؟'

اس نے افسوس ظاہر کرنے کے انداز میں سر ہلایا۔ مکڑی جالا بن چکی تھی اور اب اس کے بیچ میں کھڑی اپنے متعدد بازوؤں کو پھیلائے کسی مکھی کے تاک میں تھی...

— 'آہ... ہاں! تم اندازہ نہیں کر سکتے کتنا دلچسپ تھا وہ سماں! ایک بار لبلبی پریس کیا اور معاملہ ختم... یہ لوگ ہمیں بس ایک ہی میگزین دیتے ہیں....'

— 'چلو اب..'

وارڈ بوائے نے اس کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹا، تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا...، تب سے جب ایک سخت چوٹ اس کی گردن پر پڑی تھی پھر اسے فوج کی گاڑی میں اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا، پہلی بار وارڈ بوائے کے سلوک میں اسے کچھ اپنائیت محسوس ہوئی... اس فرحت بخش احساس کے خمار میں اس نے نوٹس کیا کہ اس کی فوجی وردی اتار لی گئی ہے اور ایک عجیب و غریب لباس اسے پہنا دیا گیا ہے... لیکن وہ نہیں جاننا چاہتا تھا کہ ایسا کب ہوا..

— 'تم نے دو کو مار گرایا..'

— 'کس نے؟'

— 'تم نے۔ تمہاری گولی سے ان کے دو لوگ مارے گئے تھے'۔

— 'اس میں کیا بڑی بات ہے...؟ انسان جب گولی چلاتا ہے تو کچھ نہ کچھ تو اس کے نشانہ پر ہوتا ہی ہے...'

— 'تم نے قصداً گولی چلائی...؟'

— 'افوہ! تو تمہیں کیا لگتا ہے؟'

— 'میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم اعصابی خلل میں مبتلا ہو..!'

— 'کیا فرق پڑتا ہے؟'

— 'فرق یہ ہے کہ اعصابی خلل کا مریض جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا...'

جھٹکے سے وہ رک گیا.. جالے کے کچھ تار ٹوٹ گئے، مکڑی اپنی جگہ پر جھولنے لگی، مگر جلد ہی اس نے سنبھالا لیا اور پھر سے زیادہ مستعدی سے بکھرے تاروں کی مرمت میں جٹ گئی۔

— 'تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے قصداً گولی نہیں چلائی؟'

— 'ہاں!'

— 'ہرگز نہیں! میں نے تو پورے ہوش و حواس میں گولیاں چلائی تھی'۔

— 'اگر ان کے سامنے تم نے ایسا بولا وہ تمہیں جیل میں ڈال دیں گے.. بہتر یہ ہو گا کہ تم اپنی زبان بند رکھو...'

مکڑی دیوانہ وار زور و شور سے کام میں لگی اس کی پیشانی میں شور برپا کرنے لگی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ اب گر پڑے گا... اس کا سر چکرایا، طویل راہداری دفعتاً گھومنے لگی ور پھر اپنی جگہ آ گئی...

— 'مجھ سے لوگ یہ کیوں کہلوانا چاہتے ہیں کہ میں نے قصدا ایسا نہیں کیا تھا؟'

— 'اس لئے کہ وہ کوئی عقلمندی کا کام نہیں تھا...'

پھر سے اس نے اپنے پاؤں زمیں میں پیوست کر دئے۔ وارڈ بوائے اسے کھینچنے لگا، مگر اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا... جالے کے مزید تار ٹوٹ کر بکھر گئے...

— 'کچھ کہوں میں تم سے؟'

— 'بالکل نہیں! بس میرے ساتھ چلتے رہو، پورا دن ہم برباد کر چکے ہیں..'

— 'میں ایک قدم نہیں بڑھوں گا جب تک تم سن نہ لو...'

— 'ٹھیک ہے، کہو..'

— 'صرف اس لئے کہ میں نے قصدا ان پر گولیاں چلائیں مجھے اعصابی خلل میں مبتلا قرار دیا گیا ہے... ہے نا؟'

— 'ہاں..'

جالے کے مزید تار بکھر گئے.... ان کی مرمت کی کوشش میں سیاہ مکڑی پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی... اس نے اپنا جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا:

— 'مگر یہ لوگ جو بندوق رکھتے ہیں مگر گولیاں نہیں چلاتے اور قصدا نہیں چلاتے وہ اس مہلک اعصابی مرض کے شکار نہیں ہیں... ہے نا؟'

— 'ہاں... تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'

— 'میں کیا کہنا چاہتا ہوں؟ آہ! کچھ نہیں... کچھ بھی نہیں..'

وہ خاموشی سے چلنے لگا، راہداری کے فرش پر اس کے بھاری بھاری پاؤں پڑتے تو اس کا پورا بھاری بدن ہلنے لگتا.. مکڑی اس کی پیشانی میں ہچکولے کھاری تھی، جالے کے تار تیزی سے بکھرتے جارہے تھے... پھر وہ بول پڑا:

— 'سنو! کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ یہ بات صحیح ہے؟'

— 'کون سی بات؟'

— 'وہی جو کچھ دیر قبل تم نے اعصابی خلل کے بارے میں کہی تھی..'

— 'بالکل..'

اس نے وارڈ بوائے کو غور سے دیکھا.... مکڑی اس کی پیشانی سے غائب ہونے لگی تھی... دفعتاً جالے کے سارے الجھے تار محو ہوگئے اور اس کی پیشانی کا اندرون سفید سنگ مرمر کی طرح شفاف ہوگیا..

'اچھا، چلو پھر چیرمین کے پاس چلتے ہیں!

بیروت-۱۹۶۲

* * * * * * * * * * * * * * * * * * * *

چھ چیل ایک بچہ

عربی عنوان: ستة نسور وطفل

میں گاؤں میں موسیقی کے استاذ کے طور پر تعینات ہوا تھا.. ان دنوں ضروری نہیں تھا کہ موسیقی کے استاذ کو موسیقی کی سمجھ بھی ہو... اس کا کام بس یہ تھا کہ بچوں کو کچھ گا کر سنائے اور جب بچے گروپ میں گا رہے ہوں تو ان کا لحن درست کرے۔

میرا کام بالکل بھی مشقت طلب نہیں ہوتا، اگر موسیقی پڑھانے کے لئے مجھے تین گاؤں کے سفر نہیں کرنے پڑتے۔ پہلے کچھ مہینوں مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی نایاب ہستی ہوں، مگر یہ احساس جلد ہی اس وقت غائب ہو گیا، جب پرانے وضع کی کھٹارا گاڑی میں گاؤں کے اوبڑ کھابڑ راستے پر کسانوں کے ساتھ سفر کرنا

میرے لئے ناقابل برداشت حد تک دوبھر ہونے لگا... مزید برآں، مجھے یہ خیال بھی ستانے لگا تھا کہ میری یہ جاب میری ان آرزوؤں کا مدفن بن رہی ہے، جنہیں میں کالج سے فراغت کے دن سے سنبھال رہا تھا۔

اس گاڑی کا سفر واقعی صبر آزما تھا۔ بعض اوقات سفر کے دوران میں سونے کی کوشش کرتا، مگر تیز تیز ہچکولے کبھی نیند کو قریب پھٹکنے نہیں دیتے... جھٹکوں کے باوجود شاذونادر اگر کبھی آنکھ لگنے والی بھی ہوتی، تو کوئی ٹوکری، کوئی بطخ، یا کچھ اور، جس کو میرے بغل میں بیٹھا شخص میری گود میں سرکا دیتا، مجھے عالم بیداری میں کھینچ لاتے.. یا ساتھ میں بیٹھے کسی مسافر کی تیز کہنی سے ہڑبڑا کر اٹھ جاتا، جو اپنے ساتھی کے ساتھ درپیش کسی نزاع میں مجھ سے فیصل بننے کی درخواست کرتا...

بادل نخواستہ یہ سب کچھ مجھے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس ہمتِ برداشت کے پیچھے ایک وجہ تھی، جو وجہ صرف گاؤں میں بحال ایک مدرس ہی سمجھ سکتا ہے... گاؤں میں معلم کو ایک مقدس ہستی سمجھا جاتا ہے... ہمارے لئے یہ بہت شاق تھا کہ ہم کسی سطحی آہ اف سے، یا کسی سخت کلام سے اپنی قداست کی چادر تار تار کر دیں... اسی لئے جب بھی ہمیں کسی معاملے میں زبردستی گھسیٹا جاتا ہم اپنے سر ہلا دیتے، یا جب کوئی کسان ہم سے دستِ مدد کا خواستگار ہوتا ہم اس کی دلجوئی میں مسکرا دیتے..

یہ سب کچھ میں بے دلی سے سہہ لیتا تھا... لیکن لحاظ و وقار کے اپنے خول سے مجھے اس وقت باہر آنا پڑتا، جب کوئی کسان کسی کھٹارا گاڑی میں جو سنگلاخ

پہاڑی راستے پر ہچکولے کھا رہی ہوتی، اور ایسے وقت میں جو کہ دو کلاس کے درمیان میرے آرام کو ہوتا تھا، مجھے زبردستی اپنی گفتگو میں شریک کرنے کی کوشش کرتا اور پورے راستے میری توجہ کا طالب رہتا۔

— 'سر، کیا آپ نے وہ چٹان دیکھا ہے؟'

ایک دن ایک بوڑھے کسان نے کھڑکی سے ایک چھوٹے ٹیلے پر نوک کی طرح ابھرے چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

— 'جی ہاں، ہفتے میں تین بار تو میری نظر اس پر پڑتی ہی ہے'۔

اس کی انگلی چٹان کی جانب تنی رہی اور اس نے دوسرا سوال داغ دیا:

— 'کیا آپ کو اس کی کہانی پتہ ہے؟'

— 'اچھا، تو اب اس چٹان کی بھی کوئی کہانی ہے؟'

یہ جانتے ہوئے بھی کہ گاؤں میں ہر چیز کی ایک کہانی ہوتی ہے، میں نے استعجاب سے پوچھا، گرچہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس دور دراز نا قابل التفات راستے میں پڑے اس چھوٹے چٹان کی بھی کوئی کہانی ہو سکتی ہے۔ میرے سوال میں ایک ہلکا تمسخر تھا۔ میں نے میگزین اپنے چہرے کے سامنے پھیلا لیا اور خود کو مطالعہ میں مصروف ظاہر کرنے لگا.

— 'بہت زمانے کی بات ہے...'

مطالعے میں مشغول میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ مجھے یقین تھا کہ بوڑھے کسان کی نگاہ میری طرف نہیں تھی، بلکہ وہ چٹان کو گھورتے ہوئے رفتہ رفتہ کھڑکی کے افق میں ڈوبتا جارہا تھا۔

— 'ہر روز دو بار میں اس راستے سے گذرتا تھا، اور ہمیشہ مجھے اس چٹان پر ایک مٹیالے رنگ کا چیل کسی حنوط شدہ چیز کی طرح ایستادہ نظر آتا۔ سویرے ہی وہ چیل وہاں آجاتا، بڑے بڑے بازوؤں کو پھیلائے اس کے اوپر کچھ دیر چکر لگاتا، پھر آرام سے اس پر اتر کر، شام تک وہیں جما رہتا۔ شام کو وہ دوبارہ پہاڑوں کی طرف اڑ جاتا...'

میں نے میگزین سمیٹ کر اپنی جیب میں رکھ لیا، اور ایک نظر اس کسان پر ڈالی۔ وہ ایسے محو تھا جیسے اپنی کسی اولاد کی کہانی سنا رہا ہو:

— 'چھ مہینوں تک کبھی اس کے معمول میں ناغہ نہیں ہوا..'

— 'اچھا، اور وجہ کیا تھی، آپ جانتے ہیں؟'

بوڑھے کسان نے میری طرف دیکھا، جیسے پہلی بار اسے میری وہاں موجودگی کا احساس ہوا ہو... تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے پھر سے کھڑکی کی طرف رخ پھیر لیا اور کہنے لگا:

— 'جانور جو بھی کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں کسی کو نہیں پتہ، لیکن وہ چیل اصل میں اسی چٹان پر پیدا ہوا تھا... اس کی ماں اتنی بوڑھی ہو چکی تھی کہ انڈے دینے کے لئے پہاڑوں تک اڑ کر نہیں جا سکتی تھی، اس لئے

اس نے وہیں انڈے دے دئے، اور جیسے ہی چوزہ چیل انڈا توڑ کر باہر نکلا، وہ چل بسی اور وہی چٹان اس کا مرقد بن گیا'۔

کھڑکی سے چہرہ ہٹا کر کسان نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا:

— 'جب چوزہ چیل بڑھاپے کو پہونچا اور اسے یقین ہونے لگا کہ اب اس کی موت قریب ہی ہے وہ روزانہ یہاں آکر اسی جگہ بیٹھ کر اپنی موت کا انتظار کرنے لگا، جہاں اس کی ماں کی موت ہوئی تھی'۔

— 'وہ بھی مر گیا؟'

— 'ہاں.. ایک دن جب میں یہاں سے گذرا میں نے اسے نہیں دیکھا'۔

میں نے میگزین نکال کر اپنے سامنے پھیلا لیا... مگر بوڑھے کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی...

— 'چیل ایک وفادار پرندہ ہے'۔

لوٹتے وقت، ایک نوجوان دیہاتی میرے بغل میں آ بیٹھا۔ اس کے ساتھ ایک بڑی سی مکئی کی بوری تھی۔ پہلے پہل ہمارے درمیان مختصر بات چیت ہوئی... جیسے ہی ہم چٹان کے پاس سے گذرے، اس نے میرے کندھے میں کہنی ماری اور کھڑکی سے باہر چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی میں نے کہا:

— 'اللہ رحم کرے چیل پر... تم بھی یقیناً اس کی کہانی سن چکے ہو... بڑا ہی وفادار چیل تھا..'

اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ران پر گر گیا، پھر اس نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا:

— 'محبت... محبت سب کچھ کراتی ہے..'

— 'محبت!.. کون سی محبت؟'

— 'یقیناوہ اس سے بہت محبت کرتی تھی..'

— 'کون؟'

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا:

— 'مادہ چیل جو مر گئی!.. لگتا ہے تمہیں کہانی نہیں معلوم...'

وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تاکہ بالکل میرے آمنے سامنے ہو جائے۔ مکئی کی بوری اس نے میرے گھٹنوں پر رکھ دی، اور پھر بتانے لگا:

— مادہ چیل روزانہ صبح یہاں آتی تھی... چٹان کے اوپر ایک چکر لگا کر اس پر بیٹھ جاتی، اور پھر شام ہونے پر شفق کے پھیلتے ہی پہاڑوں کی طرف پرواز کر جاتی...'

— 'لیکن کیوں؟'، میں نے گہری سانس لیتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔

— 'لمبی کہانی ہے... لوگ کہتے ہیں کہ اس مادہ چیل کے لئے ایک بار دو نر چیل کے درمیان اسی چٹان پر زبردست لڑائی ہوئی... فضا کو چیرتی ان کی چیخ و پکار دور تک سنائی دے رہی تھی... چونچوں کی دھار سے دونوں لہولہان ہو گئے... آخر ایک نے دوسرے کا کام تمام کر دیا۔ مگر مادہ چیل فتحیاب چیل کو پسند نہیں کرتی تھی... پھر ہوا یہ کہ، اس بے

چارے چیل کو مادہ چیل سے بھی لڑنا پڑا، لیکن اسے شکست فاش ہوئی اور وہ بھی اپنے رقیب ہی کی طرح مقتول ہو گیا...'

— 'پھر؟'

— 'پھر مادہ چیل اس چٹان پر دونوں عاشقوں کا عمر بھر ماتم مناتی رہی، حتی کہ اس کی بھی موت ہو گئی..'

— 'جانتے ہو اس کی موت کیسے ہوئی؟'

— 'یقیناً اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہو گا...'

پھر سے وہ اپنی نشست میں سیدھا ہوا اور کھڑکی سے باہر بیابان پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا:

— 'مادہ چیل سنگ دل ہوتی ہے...'

دونوں کہانیاں میرے ذہن سے محو ہو چکی تھیں، اگر، ایک ہفتے بعد ایک عمر رسیدہ عورت نے مجھے یاد نہیں دلایا ہوتا،۔ ڈھیلے ڈھالے لباس میں وہ گاڑی میں میرے پہلو میں بیٹھی تھی:

— 'اگر اس کا شوہر اس کی جگہ ہوتا، کیا وہ بھی اسی کی طرح کرتا؟'

عورت نے چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے ایسے دیکھا جیسے مجھ سے اپنے بات کی تائید کروانا چاہتی ہو۔

— 'کیا پتہ؟ ہو سکتا ہے وہ بھی ایسا ہی کرتا... اسی کی وجہ سے تو اس نے جان دی..'

— 'اس کی وجہ سے؟' عورت نے چنگھاڑتے ہوئے کہا.. پھر اپنا سر ہلاتے ہوئے کہنا شروع کیا:

— وہ دونوں ہمیشہ یہاں آتے تھے... ہر ہفتہ یہاں سے گزرتے ہوئے میں انہیں ایک دوسرے سے چونچ لڑاتے اور بلیوں کی طرح ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے دیکھتی تھی... اس وقت ابوالحسن سے نئی نئی میری منگنی ہوئی تھی، اس لئے جب بھی یہاں سے میرا گذر ہوتا میں انہیں بڑے غور سے دیکھتی... پھر کچھ دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ وہاں اکیلی رہ گئی... مجھے یقین ہے کہ وہ کسی اور مادہ کے پیچھے پُھر ہو گیا ہو گا...'

مجھے ہنسی آگئی اور میں نے مذاق کے انداز میں پوچھا:

— 'آپ کو کیسے معلوم وہ کسی اور کے ساتھ اڑ گیا؟'

— 'تم سب کے سب ایسے ہی ہو... چیل بھی تمہاری ہی طرح ہیں... شاید اسے بھی کوئی کم عمر مل گئی ہو گی، اس لئے اسے چھوڑ گیا..'

اس نے جذباتی ہو کر میری طرف دیکھا، اور ہتھیلی سے میری جانگھ پر مارتے ہوئے کہا:

— 'تمہیں پتہ ہے؟ مادہ چیل اس کے بعد بھی ہر روز یہاں آتی رہی... اس کا انتظار کرتی رہی، اسے آواز دیتی رہی... اور آخر کار مر گئی..'

— 'کیسے؟'

— 'یقیناً اس کے غم میں!'

اس بار جب میں واپس ہو رہا تھا، میں گاڑی میں اکیلا ہی تھا... مگر ڈرائیور نے مجھے سکون کی سانس نہیں لینے دیا.. چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، انجن کے شور و غل کے بیچ وہ بھی گلا پھاڑنے لگا:

— 'لوگوں میں ایک چیل کے بارے میں جو اس چٹان پر نظر آتا تھا، بہت سی کہانیاں مشہور ہیں... لیکن وہ سب کی سب خیالی کہانیاں ہیں... چیل اس چٹان پر اس لئے نظر آتا تھا کیونکہ یہاں اس کا گھونسلہ تھا... پھر اس نے اپنا گھر بدل لیا...'

— 'کیوں؟'، میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے تاکہ وہ میری آواز سن سکے، اس سے چیختے ہوئے پوچھا۔

— 'ان دنوں جب وہ چیل اس چٹان پر بیٹھتا تھا، میں اور میرا ایک ساتھی، بس ہم دونوں ہی اس راستے کو استعمال کرتے تھے... ہم لوگ بھی ایک آدھ بار ہی ادھر سے گذرتے... رفتہ رفتہ مگر اس پر گاڑیوں کی تعداد بڑھتی گئی، جن میں اکثر ڈیزل سے چلتی تھی۔ ڈیزل کا دھواں بہت خراب ہوتا ہے، اور اس سے زیادہ پریشان کن وہ شور تھا جو گاڑیوں سے اٹھتا ہے... چٹان اب گھر کے لئے مناسب نہیں رہ گیا تھا، اس لئے گھونسلہ سمیت وہ پہاڑوں کی طرف چلا گیا'۔

دن گذرتے گئے، غالبا ایک ہفتہ گذر گیا۔ اس دوران میں اپنی اچانک علالت کی وجہ سے سفر نہیں کر سکا تھا.. صحت بحال ہونے کے بعد اس بار جب میں روانہ ہوا، ایک نیا شخص گاڑی میں میرا ہم سفر تھا، اس کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ وہ خاموش تھا.. گاؤں میں وہ کام کے لئے نیا نیا آیا تھا... مجھے اس بات سے خوشی تھی کہ پورے راستے وہ چپ چاپ رہا... مگر جیسے ہی ہم چٹان کے پاس سے گذرے میں نے اسے کہنی ماری... میں خموشی سے اکتا چکا تھا، اس لئے بات چیت شروع کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا:

— ادھر دیکھو... آنے والے دنوں میں اس چٹان کے بارے میں تم بے شمار کہانیاں سنو گے... چیل کی کہانیاں..'

— 'چیل کی کہانیاں؟'

— 'ہاں..'

وہ چپ ہو گیا، اور مجھے لگا جیسے وہ پھر سے سونے والا ہے، تو میں نے پھر گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

— 'میرا خیال ہے کہ وہ چیل چھوٹا تھا.. وہ روزانہ یہاں آکر شام تک اسی چٹان پر اس لئے پڑا رہتا تھا کیونکہ اس کہ پر چھوٹے تھے، اور وہ ان چھوٹے پروں سے کسی بڑے چٹان تک اڑ کر نہیں پہونچ سکتا تھا.. مگر جب وہ تھوڑا بڑا ہو گیا اس نے کوئی اور اونچی جگہ ڈھونڈھ لی ہو گی...'

میرے ساتھ بیٹھے شخص نے بے دلی سے سر ہلا دیا، اور مجھے سمجھ میں آگیا کہ اسے میری گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں ہے.. وہ پھر سے سو گیا...

واپسی میں ایک پرانا سفر کا ساتھی میرے ساتھ تھا.. اس تمام عرصے میں وہ چٹان نہ صرف یہ کہ راستے کے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر چکا تھا، بلکہ وہ گفتگو کا بھی رمز بن چکا تھا.... جیسے ہی ہم اس کے پاس سے گذرے، میں نے اس ساتھی کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا:

— 'تمہیں اس چٹان کے بارے میں کچھ پتہ ہے؟'

— 'میرا اور اس کا چولی دامن کا ساتھ ہے'۔

— 'اچھا... کیسے؟'

— 'اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے پچھلی نوکری سے نکالے جانے کے بعد سے میں یہیں مصروفِ کار ہوں.. اس لئے مجھے چیل کی ہر کہانی کا علم ہے..'

— '... اور تمہارے حساب سے کون سی کہانی حقیقت سے قریب تر ہے؟'

سیٹ پر اچھی طرح پسر کر، کابلی سے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا:

— وہ چیل... آہ وہ یہاں بس اس لئے آتا تھا کیونکہ اسے یہاں آنا پسند تھا... اس میں کیا پہیلی ہے؟ کوئی بھنورا کیوں ایک پھول پر بیٹھتا ہے، دوسرے پر نہیں؟ یہی بات ہے... وہ چیل یہاں آتا تھا.. اس چٹان پر بیٹھتا تھا.. پھر شام کو آرام سے اپنے گھونسلے کی طرف لوٹ جاتا تھا..'

— 'مگر لوگ کہتے ہیں کہ وہ مر گیا..'

— 'ہاں...مارا گیا..'

اس نے انگلی سے ایک سفید جھونپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو تقریباً وہاں سے ۱۰ میٹر کی دوری پر تھا، کہا:

— اس پولیس چوکی کے یہاں بننے سے پہلے وہ چیل اس چٹان پر روزانہ آتا تھا۔ پولیس چوکی بننے کے بعد بھی وہ پابندی سے آتا رہا، مگر ایک دن گشتی دستے کے کسی سپاہی نے اس کی تیز چیخ و پکار سے تنگ آکر اپنے ریوالور کی ایک گولی اس پر داغ دی'۔

— 'کیا گولی اسے لگ گئی؟

اس نے آہستہ سے گردن ہلا دیا، اور چوکی کی طرف دیکھنے لگا، پھر میرے کان میں کہا:

— گولی اسے لگی تو ضرور، لیکن وہ فوراً نہیں مرا... اس نے اڑنے کی کوشش کی، لیکن زیادہ اوپر نہیں جا سکا اور وادی میں گر گیا۔

سردی کا موسم آیا، تو گاڑیاں دوسرے راستے سے آنے جانے لگیں جس پر برف نہیں جمتی تھی... سردی بھر، میں نے نہ تو چٹان کی بات سنی اور نہ چیل کی... سردی گذری، بہار آیا اور گاڑیاں پھر سے اسی پرانے راستے پر چلنے لگیں...

میں چٹان کو بھول چکا تھا، پتہ نہیں شاید اس وجہ سے کہ اس کے بارے میں اس دوران کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی، یا اس لئے کہ موسم بہار نے راستے کے منظر

اتنا دلکش بنا دیا تھا کہ ساری توجہ اسی منظر میں کھوئی رہتی.. وجہ جو بھی ہو، کئی دن گذرنے کے بعد ایک دن میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اچانک مجھے وہی چٹان نظر آ گیا.. کیا دیکھتا ہوں اس کے اوپر ایک بڑا چیل دونوں خاکی رنگ کے بازوؤں کو سمیٹے کسی حنوط شدہ چیز کی طرح بیٹھا، راستے کی طرف دیکھ رہا ہے..

— 'چیل واپس آ گیا...'

میں نے چٹان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اپنے ساتھ بیٹھے مسافر سے جو کہ ایک بچہ تھا، ایسے انداز میں کہا جیسے میں کوئی بڑی خبر سنا رہا ہوں...

— 'کون سا چیل؟'

بچے نے معصومیت سے جدھر میں نے اشارہ کیا تھا دیکھتے ہوئے پوچھا.. میں نے انگلی سے کھڑکی کے باہر چٹان کی طرف اس کی نظر پھیرنے کی کوشش کی..

— 'وہی جو اس چٹان کے اوپر نظر آ رہا ہے... کیا تمہیں اس کی کہانی نہیں پتہ؟'

— 'اس چٹان کے اوپر؟'

— 'ہاں..'

اس نے نا سمجھی سے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں نے اپنا سر جھٹکا، جب کہ میری انگلی چٹان کی طرف اٹھی رہی.. بچہ کچھ دیر غور سے میرا چہرا پڑھتا رہا پھر دھیمے لہجے میں کہنے لگا:

— 'وہ کوئی چیل نہیں... غور سے دیکھئے... جنگلی توت کا جھاڑ ہے، جو ہر بہار میں چٹان کے پیچھے سے سر ابھارتا ہے اور پھر گرمی میں مرجھا کر سوکھ جاتا ہے، یا مرجھانے سے پہلے ہی خرگوش اسے چٹ کر جاتے ہیں..'

میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور مجھے لگا کہ بچہ سچ بول رہا ہے... مگر میں آسانی سے ہار نہیں مان سکتا تھا، تو میں نے تردد کے ساتھ پوچھا:

— 'کیا تمہیں پکا یقین ہے؟'

وہ پھر مسکرایا، جیسے کسی جاہل معلم کو دیکھ کر اسے لطف آرہا ہو، اور اپنی چھوٹی ہتھیلیوں کو پھیلاتے ہوئے پُریقین انداز میں اس نے کہا:

— 'جب توت پک جاتے ہیں تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ میں انہیں چرانے کے لئے وہاں جایا کرتا ہوں... سچ میں بڑے ہی میٹھے توت ہیں...!'

بیروت-۱۹۶۰

ختم شد

FALASTEEN KI GALYAN

Selected Short Stories of Ghassan Kanafani

Translated by:

Dr. Mohammad Ali Akhtar Nadwi
M. Phil, Ph.D. (JRF/SRF), JNU

'تم نے مجھ سے یہ کیوں کہا تھا کہ تم کیک بیچتے ہو؟ کیا تمہیں اپنے اس کام سے شرم آتی ہے؟'، حمید کی نظریں نیچے جھک گئیں۔ پھر اس نے اپنی گہری شفاف آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کچھ شرمسار لہجے میں کہا:

'نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ میں واقعی میں کیک بیچا کرتا تھا، بس کل ہی میں پھر سے اِس کام میں لگا ہوں'۔

'لیکن کیک بیچ کر تم زیادہ نہیں کما لیتے تھے؟'

'ہاں لیکن...'، نظریں اٹھائے بغیر اس نے پھسپھاتے ہوئے کہا:

'رات کے آخری پہر مجھے بھوک لگ جاتی تھی اور میں دو تین کیک خود ہی کھا جاتا تھا'۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں اور کیا کروں! پہلے تو یہ خیال گذرا کہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوں، لیکن میرے اندر اس کی سکت نہیں بچی تھی.... اس کا سر جس پر کالے کھردرے بال چمک رہے تھے جھکا رہا۔ بے خیالی سے میں نے اپنا پاؤں اٹھایا اور اسے چوبی بکس کے کوہان پر رکھ دیا۔

دو چھوٹی ہتھیلیاں مہارت سے جوتے پر حرکت کرنے لگیں، ساتھ میں اس کا چھوٹا سر بھی ایک لے میں ہلتا جا رہا تھا۔ پھر وہ بڑی سادگی سے بولا:

'سر! آپ نے سال بھر سے اپنا جوتا نہیں بدلا.... یہ وہی سستا والا جوتا ہے!'

مرکزی پبلیکیشنز
MARKAZI PUBLICATIONS
R-373/3, Jogabai Ext., Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025
Mob: 9811794822 / 21, E-mail: markazipublication@gmail.com